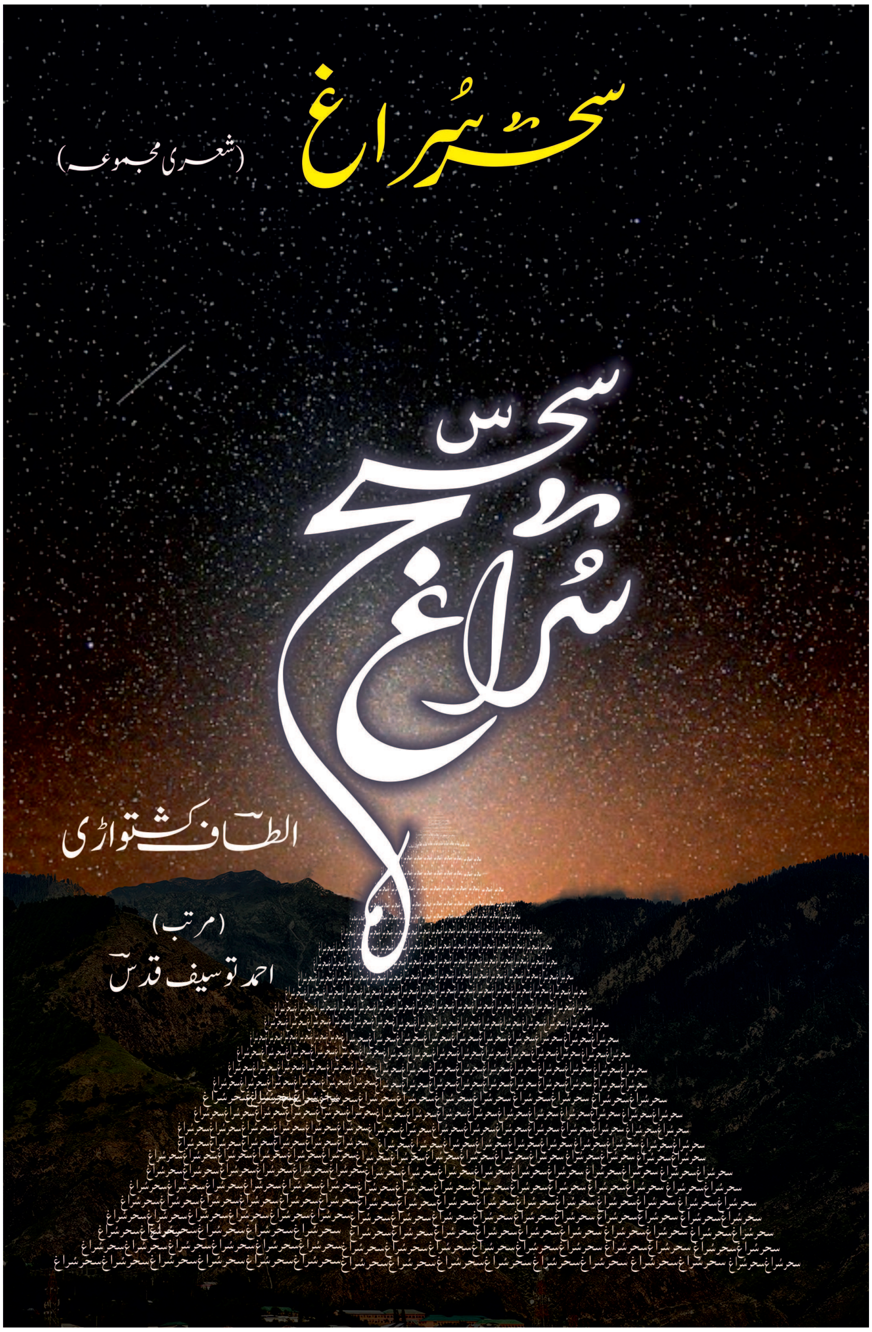
سحر سُراغ
(شعری مجموعہ)
سحر سُراغ
الطاف کشتواڑی
(مرتب)
احمد توصیف قدسؔ

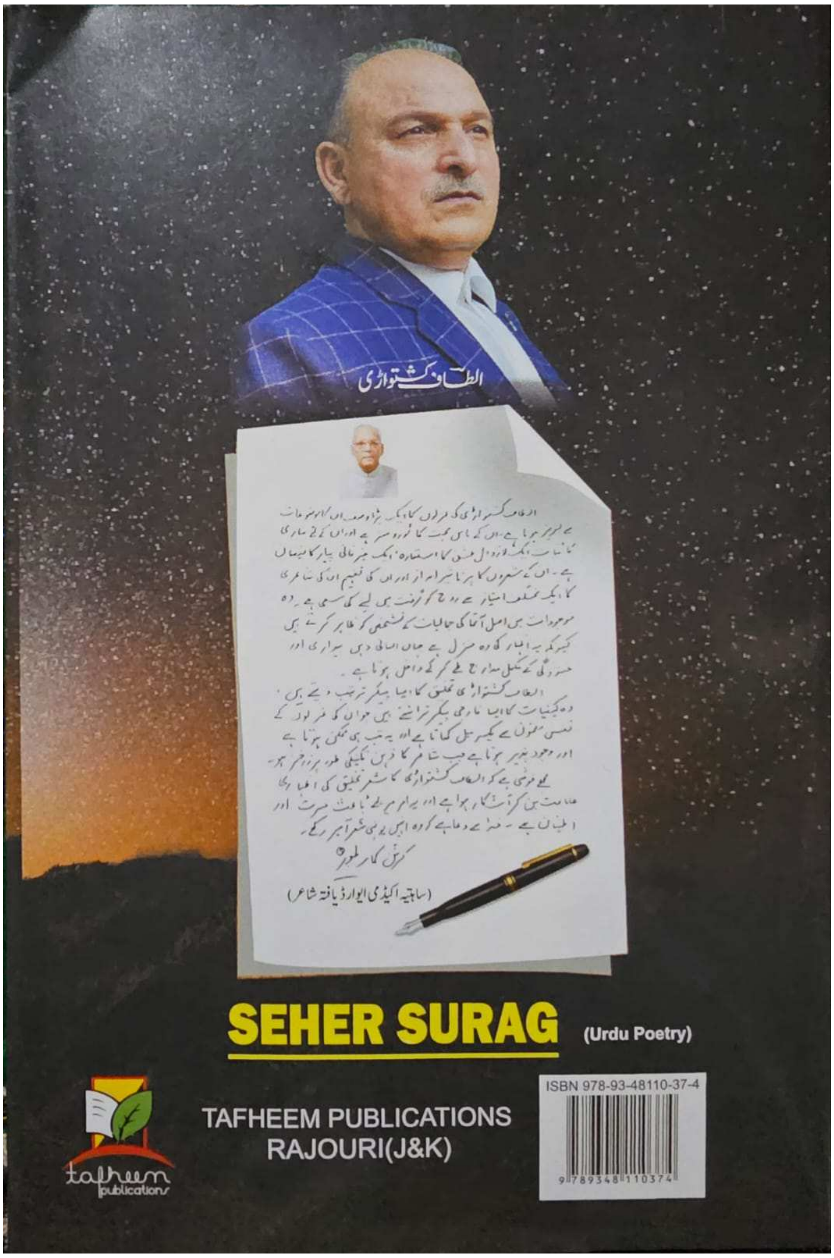
الطاف کشتواڑی
(ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ یافتہ شاعر)
SEHER SURAG
(Urdu Poetry)
TAFHEEM PUBLICATIONS
RAJOURI(J&K)
ISBN 978-93-48110-37-4
tafheem publications

سحر سُراغ

الطاف کشتواڑی

مرتب:

احمد توصیف قدس

©الطاف کشتواڑی

SEHER SURAG

by

Altaf Kishtwari

Compiled by : Ahmed Tawseef Qudus
Year of Edition 2024
ISBN:
Price Rs. 600/-

نام کتاب	:	سحرِسُراغ
شاعر	:	الطاف کشتواڑی
مرتب	:	احمد توصیف قدس
سنِ اشاعت	:	۲۰۲۴ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۶۰۰ روپے
سرورق	:	الطاف کشتواڑی
کمپوزنگ سیٹنگ	:	نسیم اختر/الطاف کشتواڑی
فوٹو کمپوزنگ	:	احمد توصیف قدس
ملنے کا پتہ	:	تفہیم پبلی کیشنز، راجوری (جموں وکشمیر)
		ساحر ملٹی کلر پرنٹرس کشتواڑ (جموں وکشمیر)
		نزد گوردوارہ چوک کشتواڑ:182204

نتساب

اپنی ماں کے نام جس نے اپنا سب کچھ میرے لئے
نچھاور کیا۔ اہلیہ محترمہ کے نام جو عمر کے اِس حصّے تک میری
دیوانگی برداشت کر رہی ہے۔ اپنے تینوں فرزندان ندیم
،توصیف اور ثاقب کے نام جو مرے کل کا آئینہ ہیں
اور بیٹی مہک کے نام جو میری زندگی میں خوشبو بن کر آئی۔

الطاف کشتواڑی

جو نہ لے سکا تھا ترے لئے، یہی سوچ کے تو دُکھی ہوئی
وہ ترے نصیب کی بالیاں، اُسی طاق میں ہیں رکھی ہوئی

ترتیب

1۔اِنتساب	صفحہ
2۔دیبَاچہ	صفحہ
3۔میری رسیدی ٹکٹ	صفحہ
4۔میری بات	صفحہ
11۔حمد	صفحہ
12۔نعتیہ اشعار	صفحہ
13۔منقبت	صفحہ
14۔غَزلیں	صفحہ تا

پروفیسر کوثر مظہری

الطاف کشتواڑی کی غزلیں

الطافؔ کشتواڑی کا شعری مجموعہ تین سو صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے۔ حمد، نعتیہ کلام اور منقبت کے بعد غزلیں ہیں۔ یہ ایک شعر دیکھئے:

چپّو ہیں غم زدہ انھیں دیمک نے کھا لیا
روٹھی ہے برف ٹین کا چھپر اُداس ہے

اس کی امیجری پر غور کیجئے۔ چپّو کا غم زدہ ہونا اس لیے کہ اسے دیمک نے کھالیا ہے اور دوسرے مصرعے میں برف باری کا نہیں ہونا جس کے سبب چھپّر بھی اُداس ہو گیا ہے۔ ایک بڑا ہی المیہ کردار اور تناظر خلق کرتا ہے۔ چپّو کو اگر دیمک نے کھالیا ہے تو یہ اس بات کا استعارہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب کشمیر میں روزی روٹی کا ذریعہ جو چپّو چلانا بھی ہوا کرتا ہے، وہ سلسلہ رک گیا ہے۔ دیمک نے اس کی صورت حال کو مزید کرب آمیز بنا دیا ہے۔ برف باری سے لطف اندوز ہونے کے لئے سیاح آتے ہیں، ان کا آنا بھی بند ہو گیا ہے۔ یہ شعر کشمیر کا ہی کوئی شاعر کہہ سکتا ہے۔ یہاں فن کے لحاظ سے غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ شاعری میں تخلیقیت کی جہتیں کس طرح مفاہمت سے ہم آمیز ہو جاتی ہیں۔ الطافؔ کشتواڑی نے اس نوع کے بہت سے فنی رموز کو برتنے میں مفاہمت کا دامن تھامے رکھا ہے جس میں ایک طرح کی صلابت بھی ہے اور استحکام بھی۔ اس کے علاوہ الطافؔ صاحب کی غزلوں

میں عصرِ دوراں کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ اپنی ذات اور کائینات کی ہم آہنگی کے نشانات بھی موجود ہیں۔ حُسن و عشق کی کرچیاں بھی ہیں اور زندگی کے پیچ و خم سے گزرنے کا حوصلہ بھی۔ وہ ایک نہایت ہی پُرعزم تخلیق کار ہیں جو کم و پیش اپنے چہار جانب ہی نہیں بلکہ تحت و فوق پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ وہ چوکنا اور بیدار رہتے ہیں۔ پوری کتاب کا آپ مطالعہ کیجئے۔ فی الوقت بطورِ مثال ان کے یہ اشعار آپ قارئین کے لئے پیش کرتا ہوں:

یاد کترن کی طرح دل سے گزرتی ہے کبھی
کاٹتی ہے مری دیوار وہ سیلن کی طرح

تمھارے ہاتھ سے یہ آئینہ نہیں ٹوٹا
یہ میری شکل بکھرنے کے سلسلے ہوں گے

ہے شہرِ دل میں تماشہ یہ سانس کا کیسا
ہوا کا کھیل ہی چلتا رہا کئی دن سے

اس مجموعہ کلام کی اشاعت پر الطاف کشتواڑی صاحب کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتے ہوئے بہت خوشی ہو رہی ہے۔

✶✶

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
17 اگست 2024

احمد توصیف قدس (ابن الطافؔ)

الطافؔ کشتواڑی کی شعری خصوصیات

سماج افراد کا مجموعہ ہے۔ یہ افراد یکساں نہیں ہوتے بلکہ اپنی صلاحیتوں، قابلیوں اور محنتوں میں یکتا اور منفرد ہوتے ہیں۔ سب کا اپنا اپنا رول ہے اور سماج کی ہیئتِ اجتماعی کے واسطے سب ضروری ہیں۔ لیکن ادیب کا رول سماج میں اس لیے زیادہ ہے کیونکہ وہ نباض اور فطرت شناس ہے۔ اُس میں سوچنے اور تجزیے کی وہ صلاحیت ہوتی ہے جو کسی اور کے پاس نہیں ہوتی۔ ادیب بیک وقت مصلح بھی ہوتا ہے اور واعظ بھی، وہ نفسیات کے علم سے واقف ہوتا ہے اور دردشناسی کے وصف سے بھی۔ جس آنکھ سے ادیب چیزوں کو دیکھتا ہے، غیر ادیب نہیں دیکھ پاتا۔ ادیب کا محمود و مطلوب صرف اظہارِ ذات نہیں ہوتا بلکہ اُس کی نظر سماج کی ہیئتِ اجتماعی پر ہوتی ہے۔ اُس کی سوچ اور فکر کا دائرہ بڑا ہوتا ہے۔ ادیب کا ایک خاص اسلوب ہوتا ہے جو دل نشین بھی ہوتا ہے اور دماغ نشین بھی، یعنی وہ فرد کے دل اور دماغ دونوں کو ایڈریس کرتا ہے۔

ادیب کی تعریف میں جو سب باتیں عرض ہوئیں، اُن سب باتوں کی جھلک جناب الطافؔ کشتواڑی کی شاعری میں کہیں نہ کہیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ الطافؔ کشتواڑی کے ہاں سوچنے کا ایک خاص زاویہ ہے جو اُن کی پوری فکر اور سوچ کو متاثر کرتا ہے۔ اُن میں خیالات کی وہ پختگی ہے جو ایک موضوع پر بات کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ یہ خیالات کسی تقریر یا مضمون کے ذریعے سامنے نہیں آتے بلکہ انھیں ایجاز واختصار اور سجاوٹ کا ایک حسین پیکر ملتا ہے جسے شاعری کہا جاتا ہے۔ وہی شاعری جسے الطافؔ کشتواڑی اپنی زیست کا ایک قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں۔

شاعری انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ رشید احمد صدیقی کے مطابق ''شاعری دنیا کی مادری زبان ہے''۔ ہر زمانے میں شاعری اور دیگر فنونِ لطیفہ کو سماج میں ایک مرکزی حیثیت رہی ہے۔ یہ قوموں کی پہچان ہے اور اس نے سماج کے اقدار بدلے ہیں۔ ہر شاعر نے کسی نہ کسی حیثیت سے سماج کی اجتماعیت کے واسطے کچھ نہ کچھ ضرور contribute کیا ہے جس سے شاعر کا فن اہم اور قابلِ قدر بن جاتا ہے۔ الطاف کشتواڑی کا فن بھی اہم اور قابلِ قدر ہے۔ آپ کی شاعری اظہارِ ذات سے سفر کرتے ہوئے اظہارِ کائنات پر ختم ہوتی ہے جس سے آپ کی شاعری کا کینوس وسیع ہو جاتا ہے۔

الطاف کشتواڑی جس بیک گراؤنڈ سے آتے ہیں، اُس میں آپ اکلوتے شاعر ہیں۔ آپ نے ناموافق حالات کے سبب اپنے فن کو مردہ ہونے سے بچایا ہے۔ وہ جہاں بھی گئے اور جس ماحول میں بھی رہے ہیں، اپنے اس فن کی آبیاری کے راستے تلاشے ہیں۔ میری اس بات کی تصدیق الطاف کشتواڑی کے استاد جناب صابر مرزا صاحب کے ذیل کے اِن جملوں سے ہوتی ہے جو موصوف نے الطاف کشتواڑی کے پہلے مجموعے ''ریزہ ریزہ آئینہ'' میں لکھے ہیں:

> ''الطاف کشتواڑی کی بلند حوصلگی کی داد اس لیے بھی دی جاسکتی ہے کہ جس ماحول میں ان کے شب و روز گزرے ہیں وہ یکسر غیر ادبی ہی نہیں غیر سنجیدہ بھی ہیں۔ جہاں پھر بھی انھوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کے محل کو پژمردہ ہونے سے بچا رکھا ہے۔''

ہر شاعر کا ایک انفراد ہوتا ہے۔ میر اور غالب دونوں شاعری کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ لیکن دونوں کے نظامِ فکر اور شعر کہنے کے عمل میں فرق ہے۔ شاعر کا یہ انفراد نہ صرف موضوعات میں بلکہ اُس کے تخیل، اسلوب اور ذخیرۂ الفاظ میں نظر آتا ہے۔ یہی چیز شاعر کو ایک جداگانہ حیثیت عطا کرتی ہے۔ ذیل میں ہم الطاف کشتواڑی کے موضوعات، تخیل، الفاظ کے چناؤ اور اسلوبِ نگارش کو اُن کی شاعری کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

وہ کیا گیا کہ زمان و مکان روٹھ گئے
تھا ایک شخص وہ سارے جہان میں شاید

تجھ کو آواز میں ڈھونڈا ہے مغنی بن کر
اک نئے سُر میں نئے راگ میں گایا ہے تجھے

جب وہ مرحوم ہوا پھر نہ ملے وہ مجھ کو
میں نے لکھے تھے ترے نام کے کتبے کتنے

یہ تین اشعار ہیں تین مختلف غزلوں کے۔ اشعار کی قرات اور پھر معنی تک رسائی سے ہمارے ذہن میں ایک شخص کا پیکر سامنے آتا ہے۔ شاعر وقت وقت پر اس کردار کو سامنے لاتا ہے۔ یہ شخص شاعر کا ایک تصوراتی خاکہ بھی ہوسکتا ہے اور کوئی انسانی وجود بھی۔ لیکن صاف ظاہر ہے شاعر اِس کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی رکھتا ہے۔ کبھی 'تھا ایک شخص جہان میں وہ شاید' سے شاعر اِس کردار کو خاص بناتا ہے تو کبھی 'مغنی بن کر' اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک دوسری جگہ پر شاعر اِس شخص سے بچھڑنے کا ماتم کرتا ہے اور اُس کی یاد کو یوں بیان کرتا ہے:

یاد کس طرح دل سے گزرتی ہے کبھی
کاٹتی ہے مری دیوار وہ سیلن کی طرح

اِس کردار کے ساتھ شاعر کا ایک پرانہ رشتہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ اُسے ایک بُت سے مشابہت دے رہا ہے جس کی وہ ایک عرصے سے عبادت کر رہا ہے۔ زمانے بیت گئے، لیکن وہ اُس کے دل کے کسی کونے میں اب بھی موجود ہے۔ اس خیال کو شاعر نے یوں باندھا ہے:

ازل سے جس کے لیے ہر نظر طواف میں ہے
وہ بت ہنوز مرے دل کے اک شگاف میں ہے

زندگی کیا ہے۔ اِس میں یہ پیچیدگیاں کیوں ہے؟ زندگی گزارنے کے طور طریقے اور خیالات و افکار میں فرق کیوں ہے؟ زندگی اگر بہار کا نام ہے تو پھر اس میں خزاں کا کیا کام؟ یہ اگر کوئی جائے

امتحان ہے تو امتحان میں شرح کامیابی کم کیوں ہے؟ یعنی باوجود محنت ومشقت کے انسان کو وہ سب کچھ کیوں حاصل نہیں ہوتا جس کا وہ مستحق ہے۔

ہر شاعر کے ہاں زندگی سے جڑی ان بنیادی باتوں کا کوئی نہ کوئی خاکہ ہوتا ہے۔ اُس کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی اصل سے واقف ہے اور وہ زندگی کا ایک اجتماعی تصور رکھتا ہے۔ زندگی کے اِسی خاکے اور تصور کو شاعر اپنی شاعری میں بیان کرتا ہے۔ ذیل کے یہ تین اشعار دیکھیں:

کچھ جام روبرو ہیں مگر بے دلی کے ہیں
حالات گردوپیش سبھی بے رُخی کے ہیں

کوئی اِس رن میں کب الطافؔ ہم سے جیت سکتا ہے
جو ہم نے جان کر کھائی ہیں وہ خاموش ماتیں ہیں

اُنھیں میرے حوادث سے بھلا الطافؔ کیا لینا
یہ فہم و دل کی ساری جنگ، کیا تم کو سنانی اب

تینوں اشعار میں ایک شکایتانہ لہجہ عیاں ہے۔ شاعر کے مطابق اِس دنیا میں چین وسکون اور آرام و راحت کو کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو وہ ایک لمحاتی کیفیت کا نام ہے اور بس۔ زندگی انسان کو اکثر اوقات بے رُخی کی وہ شکل دکھاتی ہے کہ وہ ٹوٹ جاتا ہے، یاس اور نا اُمیدی میں غرق ہوتا ہے۔ زندگی حادثات کا نام ہے۔ بے رُخی اِس کا شیوہ ہے۔

زندگی بے ثباتی کا بھی نام ہے۔ یہاں کوئی چیز مستقل نہیں ہے اور اس دنیا میں ہمیشہ کے لیے کوئی نہیں رہے گا۔ کیا شاہ و گدا، کیا عالم اور جاہل، کیا منصف اور مدعی سب خاک ہو جائیں گے۔ یہ زندگی کا وہ فلسفہ ہے جس سے کسی کو فرار نہیں۔ ذیل کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیں اور الطافؔ کشتواڑی کے ہاں زندگی کی بے ثباتی کا جو تصور ہے اُسے محسوس کریں:

سونے اور چاندی میں جو تُلتا ہی رہا
آخر وہ بھی اس دنیا میں خاک ہوا

کن اثاثوں پہ جنگ تھی الطافؔ
جاتے ہو تو ہیں مٹھیاں خالی

معنی آفرینی شاعری کا جوہر ہے۔ غالبؔ کے مطابق یہ اصلِ شاعری ہے۔ یہ شاعر کی ذہانت ناپنے کا ایک بہترین آلہ ہے۔ شاعری میں معنی آفرینی کا التزام فی الاصل ایک نازک کام ہے۔ کیونکہ اِس میں شاعر چند الفاظ یا مصرعوں میں وہ بات کہہ دیتا ہے جسے کہنے کے لیے عموماً صفحات کے صفحات درکار ہوتے ہیں۔ ذیل کے اشعار دیکھیں:

وہ آئینے گلی میں بیچتا تھا
جو اپنی شکل سے پچھتا رہا ہے

میں ہی رسی پر چلا ہوں دوستو
میری شہرت تو مرے کرتب سے ہے

جپتے ہیں ترا نام، ہے قربت نہ جدائی
تسبیح کا یہ دانہ بکھر کیوں نہیں جاتا

تینوں اشعار جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن تینوں اشعار میں معنی کی تہہ داری ہے۔

شعر اول:

وہ شخص جو خود اپنی شکل سے نامانوس ہے وہ لوگوں کو مانوسیت کا درس دے رہا ہے۔ یعنی وہ شخص وہ کام انجام دے رہا ہے جس کا وہ اہل ہے ہی نہیں۔ وہ گلی میں آئینے بیچتا ہے تا کہ لوگ آئینوں میں اپنی شکل دیکھ کر خود کا محاسبہ کریں اور زندگی کا درس لیں۔ جبکہ آئینہ بیچنے والا شخص آئینے کی حقیقت سے خوب واقف ہے۔ اُسے زندگی کا وہ راز معلوم ہے جو آئینہ خریدنے والے کو معلوم نہیں ہے۔ معلوم

ہوا آئینہ بیچنے والا شخص عیّار ہے۔ اُس کی عیّاری کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اوّل یا تو وہ مجبور ہے کہ اُسے بعض مادی چیزیں چاہیے جس کی وجہ سے وہ لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہے۔ دوم وہ سچ میں عیّار ہے یعنی اُس کی نیت ہی لوگوں کو دھوکا دینے کی ہے۔

شعر دوم:

رسّی پر چلنا ایک کرتب ہے۔ یہ ایک دشوار گزار کام ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نازک کام بھی ہے کہ رسی پر ذرا سا پیر پھسلا تو سارا معاملہ تل پٹ ہوجائے۔ شعر میں رسی پر چلنے سے مراد وہ کام انجام دینا ہے جس کو کرنے سے سب کتراتے ہیں۔ شاعر کے مطابق وہ دشوار گزار اور نازک کام اُس نے خود انجام دیا۔ لیکن بجائے Appreciation کے اُسے حقارت ملی، دُکھ اور رنج ملا۔ "شہرت" کو شاعر نے یہاں پر طنزیہ (satirical) انداز میں استعمال کیا ہے۔

شعر سوم:

عمل دو طریقوں کے ہیں۔ شعوری اور غیر شعوری۔ شعوری طور پر جو عمل انجام دیا جائے اُس میں انسان کی غرض شامل ہوتی ہے۔ یعنی اُس میں اُسے مفاد چاہیے، خوشی اور لطف چاہیے اور ایسے ہی دوسرے احساسات کی تسکین۔ لیکن غیر شعوری پر جو عمل انجام دیا جائے وہ بے غرض ہوتا ہے۔ اُس میں اگر غرض ہوتی بھی ہے تو عمل کرنے والا اُس سے بے خبر ہوتا ہے۔

معلوم ہوا کہ غیر شعوری طور پر جو عمل انجام دیا جائے اُس میں روحانیت یا کسی غیبی طاقت کو دخل حاصل ہے۔ مذکورہ شعر میں ایک شخص کو شاعر بار بار یاد کر رہا ہے۔ جبکہ اُس شخص کے ساتھ شاعر کا کوئی واسطہ ہے نہ رابطہ۔ لیکن شاعر اُس کے نام کی تسبیح پڑھے جا رہا ہے۔ رابطے کی محرومی کے سبب تسبیح کے دانے بکھر جانے چاہیے تھے یعنی اُس شخص کے نام کی تسبیح پڑھنے کا عمل رُک جانا چاہیے۔ لیکن وہ اور زیادہ مضبوط ہو رہا ہے۔ کوئی غیبی یا روحانی طاقت ضرور ہے جو تسبیح کے دانوں کو بکھرنے نہیں دیتی۔

پتھر زمانے بھر کے یہاں سہہ رہا ہوں میں
اک سچ ہی ہے کہ جس کو ابھی کہہ رہا ہوں میں

یہ کون سا سچ ہے جس کے کہنے پر شاعر کو پتھر نصیب ہوئے ہیں۔ الطاف کشتواڑی کے اِس مجموعے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی شاعری میں بعض کچھ ناصحانہ جھلکیں ہیں جس سے وہ اپنے ہم جلیسوں کو باخبر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ زندگی کی صداقتوں کو اپنے دوستوں پر آشکار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ صداقتیں کیا ہیں؟ یہ دراصل وہ آفاقی اصول ہیں جو کسی بھی انسانی سماج کا جوہر ہیں۔ غزل کے دو اشعار دیکھیں:

جوشِ دمِ طفلانِ مناسب میں ابھی ہو
ناپختہ بہت حسبِ مراتب میں ابھی ہو
ترتیب معین ہے ستاروں کی ازل سے
تم چرخ شناسی کے مطالب میں ابھی ہو

یہ باخبری بعض اوقات تنبیہ بن جاتی ہے جس میں شاعر کی تندی ظاہر ہوتی ہے۔ شعر دیکھیں:

تیری انا کے دوڑتے گھوڑوں کا کیا کریں
آجائیں گے یہ خود ہی کبھی راہِ راست پر

باخبری اور تنبیہ کے باوجود شاعر کو بدلے میں دُکھ ملا ہے اور اُس کے اخلاص کو سخت چوٹ پہنچی ہے۔ شاعر کے مطابق دنیا میں مفاد پرستی کا غلغلہ ہے اور یہاں پر شرافت کو کوئی جگہ حاصل نہیں ہے۔ ایک اور شعر دیکھیں:

کہاں الطاف تم اخلاص کی گھٹڑی اٹھائے ہو
شرافت کی تجارت کا تو کاروبار مندہ ہے

الطاف کشتواڑی جس بیک گراؤنڈ سے آتے ہیں وہ مذہبی بیک گراؤنڈ ہے۔ شادی بیاہ کی خوشی ہو یا کسی اپنے کے بچھڑ جانے کا ماتم، رسم و رواج کی انجام دہی ہو یا اور اخلاق و عادات کے اصولوں کا تعین ہر جگہ مذہب کو ایک خاص دخل حاصل ہے۔ یہاں مذہبی بیک گراؤنڈ سے مُراد پروفیشنل مذہبی بیک گراؤنڈ نہیں ہے۔ بلکہ اِس سے مُراد ہماری وہ تہذیبی زندگی ہے جس کے اصول و

ضوابط مذہب سے اخذ کیے گئے ہیں اور جو ہماری کُل میراث ہے۔

الطاف کشتواڑی خود کو اپنی مذہبی تہذیب کے اثر سے دور نہیں رکھ پائے ہیں۔ ذیل کے اشعار آپ کی مذہب پسندی کا بیّن ثبوت ہیں۔

حمدِ خدا:

اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا یہاں دیکھا وہاں دیکھا
جہاں بھی جس طرف دیکھا تجھے سب میں نہاں دیکھا

حبِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم:

آسان یہاں تم پہ ہو یہ گردشِ دوراں
کرنی ہے محبت تو کرو میرے نبی سے

تکریمِ ولی (شاہ فرید الدین بغدادیؒ):

چناب بہتا رہا ہے جہاں سے آپؒ نے بھی
پلائی ایسے اخوت چھلک نہ پائے ایاغ

فلسطین کی خونریزی پر نوحہ:

ارض دنیا پہ جو افضل تھی کبھی اعلیٰ تھی
اب ہے وہ غرقِ خرافات عجب ہے واللہ

اُمتِ مسلمہ کی بدحالی پر اظہارِ افسوس:

ہیں کہیں پاک، کہیں عرب وایران کہیں
برسرِ موجِ فسادات عجب ہے واللہ

اُمتِ مسلمہ سے شکایت:

تم تو افضل امتو میں تھے میاں
یہ ریاکاری تمہاری کب سے ہے

شبِ قدر کی بابرکت رات کے موقعے پر:

ہمیں تو جاگنا ہے آج کی شب صبحِ کاذب تک
کھلیں گے رحمتوں کے سارے در اب صبحِ کاذب تک
بہ کثرت توبہ، استغفار، الغفار سجدے میں
مداوا لادوا کا ہوگا امشب صبحِ کاذب تک

الطاف کشتواڑی کی تہذیب کشمیر کی تہذیب ہے۔ کشمیر کی تہذیب یکتائے زمانہ ہے۔ کشمیر کی زبان، آب و ہوا، رہن سہن، فیرن، وازوان، کانگڑی، سماوار، برف، ٹین، جھیل، آبشار، پہاڑ، جنگل، کشتی، چپوسب چیزوں کی کوئی نہ کوئی جھلک الطاف کشتواڑی کی شاعری میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

غنیمِ وقت کے حملے سے لوگوں کو بچانا ہے
میں آہنگر ہوں ان کے واسطے بکتر بناتا ہوں

آہنگر الطاف کشتواڑی کی ذات ہے جسے لوہاری بھی کہتے ہیں۔ کشمیر میں لوہاری کا پیشہ ایک عرصہ سے رائج ہے۔ لوہار نہ صرف گھر کی ضروری اشیاء بناتا ہے بلکہ وہ زمینداری کے آلات سے لے کر جنگوں کے ساز و سامان تک بنانے کی مہارت رکھتا ہے۔ درج بالا شعر اسی بات کی عکاسی کرتا ہے۔

کچن میں اب ہے پرانے سے برتنوں کا ہجوم
ہیں ساری صدیاں ہمارے مکان میں شاید

کشمیر کا کچن اپنی نوبہ نوع خاصیتوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ کچن میں ایک سادہ اور صاف فرش ہے جہاں پر بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا ہے۔ دیواروں پر لکڑی کے شیلف لگے ہیں جن پر لوہے اور تانبے کے برتن قرینے سے رکھے ہوئے ہیں۔ کونے پر ایک کانگڑی رکھی ہے اور شیلف کے ایک طرف ایک بڑا سماوار۔ کچن کی سامنے والی دیوار کے وسط میں ایک چولہا بھی جل رہا ہے جو نہ صرف کھانا

بنانے کے کام آتا ہے بلکہ اُس سے زندگی کی حرارت کا اصل احساس ہوتا ہے۔ یہی کشمیر کے کچن کی کہانی ہے اور اِسی کہانی کی ترجمانی الطافؔ کشتواڑی نے اپنی شاعری میں جا بجا کی ہے۔

یہاں تانی ہے چادر دیر سے چلۂ کلاں نے
بہت مدت سے یخ بستہ نیا کشمیر دیکھو

خوبصورتی کے علاوہ کشمیر کی سردی بھی لوگوں کے لیے توجہ کا مرکز رہی ہے۔ چلۂ کلاں 40 روز کی سخت سردیوں کا ایک خاص وقفہ ہے جو بہت مشہور ہے۔ 40 روز کے اِس عرصے میں سخت سردی پڑتی ہے جس سے معمولاتِ زندگی بُری طرح متاثر ہوتے ہیں۔

ہماری روٹی، ہماری خوشبو، ہمارا زر تھی
وہ زعفراں کی زمیں کسی نے لتاڑ دی ہے

زعفراں کشمیر کی پہچان ہے۔ کشمیر کے ضلع پلوامہ اور ضلع کشتواڑ میں اِس کی کاشت ہوتی ہے۔ زعفران ایک خاص قسم کا پھول ہے جو بہت قیمتی بھی ہے اور اس کا استعمال بھی خاص ہے۔

کس سے کس کا رشتہ ٹوٹا، اندر باہر سب خاموش
زونؔ کا نغمہ، میرؔ کی جھانجر، نوحہ گھر گھر سب خاموش

زونؔ سے مُراد کشمیری زبان کی شاعرہ حبہ خاتون ہے اور میرؔ سے مُراد رُسل میر ہے جو کشمیری زبان کے ایک رومان پرور شاعر تھے۔ دونوں شعراء اپنی کشمیری شاعری کی وجہ سے معروف ہیں۔ الطافؔ کشتواڑی دونوں شعراء کے فن اور شاعری سے متاثر نظر آتے ہیں۔

■

غم، دُکھ، درد، تکلیف، اداسی، بے بسی، بے چینی ایسی حسیاتی کیفیات ہیں جو زندگی کے جزوِ لازم ہیں۔ الطافؔ کشتواڑی نے اِن سب کیفیات کو نہ صرف شدت سے محسوس کیا ہے بلکہ اپنے اشعار سے اِن کی بہترین عکاسی بھی کی ہے۔ وہ اِن کیفیات کے اظہار کے لیے ایک خاص شعری اسلوب رکھتے ہیں۔ ذیل کے اشعار دیکھیں:

غم اگر سینے میں ضم ہو تو غزل ہوتی ہے
یا کوئی تازہ الم ہو تو غزل ہوتی ہے
رات سنسان ہو، بوجھل ہو سبھی کی سانسیں
روح رنگوں میں بھسم ہو تو غزل ہوتی ہے

الطافؔ کون جانے ہے یہ کیسی چپ لگی
اس کی غزل کا ہر کوئی مصرعہ اداس ہے

مٹکے اُداس ہیں یہاں گاگر اُداس ہیں
پانی کی بوند بوند کو بنجر اُداس ہیں
چپو ہے غم زدہ انہیں دیمک نے کھالیا
روٹھی ہے برف ٹین کی چھپر اُداس ہے

یہ کوئل کیسا نغمہ گا رہی ہے
مرے دل کو بہت تڑپا رہی ہے
خلاؤں میں پرندے چیختے ہیں
زمیں پر کوئی آفت آرہی ہے
نہیں کھلتا کہ ہے اب ماجرا کیا
دریچوں سے صدا کچھ آرہی ہے

ان سب اشعار کے توسط سے الطافؔ کشتواڑی فضا کو مکدر کر رہے ہیں۔ سب اشعار میں ''اداسی'' کا جو پہلو در آیا ہے وہ انسانی سماج کی ایک مشترک حیاتی کیفیت ہے۔ اداسی کا

بیان بعض اوقات اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ اداسی کی بھی اپنی جمالیات ہے۔ درد کو درد نہ کہا جائے تو وہ ناسور بن جاتا ہے۔

الطاف کشتواڑی کا اسلوب سادہ اور سہل ہے۔ وہ بڑی ترکیبوں اور اصطلاحات کا استعمال نہیں کرتے بلکہ عام اور آسان الفاظ میں اپنی بات کہہ دیتے ہیں۔ بعض الفاظ الطاف کشتواڑی بار بار استعمال کرتے ہیں جو کہ ظاہر ہے اُن کے پسندیدہ الفاظ بھی ہیں اور ان الفاظ سے اُن کی سوچ اور فکر کا دائرہ بھی متعین ہوتا ہے۔ مثلاً قلم، قرطاس، سحر، سراغ، رت جگا، پھاگن، کتب، اختر، بکتر، دھمال، اشجار، ابر، مٹکے، تشنہ لبی، پھول اور پتے، صحرا، شبِ غم، زخم، مرہم، نغمہ، گیت، تسبیح، گھنیری رات، رفوگر، ریت، مٹی، برف، شمع، کھیت، فصل، لوہار، بکتر، آہنگر، کواڑ، ریت، مٹھی، چائے، کرچیاں، جھیل، سنتور، رباب، کاغذ، کشتی، آندھی، کوئل، چنار، سحر گاہی، رُت وغیرہ یہ سب الفاظ اِس مجموعے میں جگہ جگہ پر مستعمل ملے گیں۔

الطاف کشتواڑی نے چھوٹی، بڑی اور میانہ بحروں کے سب تجربات کئے ہیں جو کہ شاعر کی ذہانت کا عمدہ نمونہ ہے۔ چھوٹی بحروں والی غزلوں میں معنی کی نزاکت اور خوبصورتی نظر آتی ہے۔ بڑی بحروں والی غزلوں میں فکر اور فلسفہ ہے۔ میانہ بحروں والی غزلوں میں معنی کی نزاکت بھی ہے اور فکر و فلسفہ بھی۔ تین بحروں کے نمونے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

چھوٹی بحر:

ہیں مناظر سے بستیاں خالی
لے رہی ہیں یہ ہچکیاں خالی

بڑی بحر:

تمام چہرے، اداس نسلوں کے، اپنی پشتوں کو دیکھتے ہیں
جو سب کی قسمت میں لکھ دیا ہے، مٹا تھا شاید، مٹا نہیں ہو

میانہ بحر:

دیکھنے میں مرے اشعار اب کچھ بھی نہیں
ہیں فقط سوچوں کا انبار اب کچھ بھی نہیں

سحرسُراغ:

’’سحرسراغ‘‘ الطاف کشتواڑی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ایک حمد، ایک نعت اور ایک منقبت کے علاوہ اِس میں 200 غزلیں شامل ہیں۔کتاب کے آغاز میں ’’میری رسیدی ٹکٹ‘‘ کے عنوان سے الطاف کشتواڑی کا پیش لفظ ہے جس میں آپ نے اپنی حیات، فن اور ’’سحرسراغ‘‘ پر مختصر لیکن اہم گفتگو کی ہے۔ بزرگ شاعر اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ ادیب جناب کرشن کمار طور اور اُستادِ محترم پروفیسر کوثر مظہری صاحب (شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) نے ’’سحرسراغ‘‘ پر تاثرات لکھے ہیں جو کہ کتاب میں شامل ہیں۔کتاب کا نام کرشن کمار طور صاحب کا تجویز کردہ ہے۔آپ نے کتاب میں شامل پورے کلام کو پڑھا اور کتاب کا نام تجویز کیا۔یہ نام الطاف کشتواڑی کو نہ صرف پسند آیا بلکہ ’’میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے‘‘ والی بات ہوگئی۔

’’سحرسراغ‘‘ مرکب لفظ ہے سحر اور سراغ کا۔سحر یعنی صبح کا وہ اولین وقت جو اُمیدوں اور اُمنگوں سے بھرا ہوتا ہے۔کیونکہ یہ رات کی سیاہی کو ختم کر کے اُسے روشنی میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔رات کی سیاہی کو ختم کرنے کی جدوجہد میں ’’سحر‘‘ کو وہ ’’راز‘‘ معلوم ہوتا ہے کہ جس راز کو جاننے کی ہم سب کو ضرورت ہے۔الطاف کشتواڑی کے مطابق آپ نے جو کچھ لکھا ہے اِسی ’’سحرسراغ‘‘ کو بیان کرنے کی کوشش میں لکھا ہے۔

اِس کتاب کی پیش کش میں ایک نیا تجربہ کیا گیا ہے۔وہ یہ کہ ہر غزل کے ساتھ ایک تصویر شامل کی گئی ہے جو اُس غزل کے کسی خاص شعر کی عکاسی کرتی ہے۔تصویریں سب کی سب نئی ہیں یعنی یہ کہیں سے ماخوذ نہیں ہیں۔اِنھیں Artificial Inteligence اور بعض اہم سافٹ ویرس اور ویب سائٹس کی مدد سے generate کیا گیا ہے۔تصویروں کی شمولیت کی غرض کتاب میں

جدت لانا ہے۔ کیونکہ جدت کا مظاہرہ بھی فی الاصل ایک تخلیقی عمل ہے۔

کتاب کا ٹائٹل پیج صاحبِ کتاب یعنی الطاف کشتواڑی نے خود اپنی تخلیقی صلاحیت کا استعمال کر کے تیار کیا ہے۔ کتاب عمر فرحت صاحب کے پبلی کیشن سینٹر "تفہیم پبلی کیشنز راجوری (جموں وکشمیر)" سے شائع ہو رہی ہے۔ کمپوزنگ نسیم اختر اور الطاف کشتواڑی نے کی ہے۔ عمر فرحت صاحب، جو کہ خود ایک نوجوان شاعر ہیں، نے اِس کتاب کی ترتیب میں کئی اہم مشوروں سے نوازا جو کتاب شائع کرنے کے پورے عمل میں معاون اور مدد ثابت ہوئے ہیں۔

✷✷

(ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)
(NET-JRF, JKSET, B-Ed)
Touseefqudus@gmail.com

الطاف کشتواڑی

میری رسیدی ٹکٹ

اس کتاب کو ترتیب دیتے وقت جب مجھے اپنی زندگی اور مختلف فنی ادوار پر کچھ لکھنے کا خیال آیا، جو کہ ظاہر ہے اس کتاب کی تکمیلیت کا جزوِ لازم ہے، تو مجھے پنجابی زبان کی مشہور شاعرہ اور فکشن نگار امرتا پریتم کی سوانح حیات کا ایک اقتباس یاد آیا جس نے فوراً مجھے اپنی گرفت میں لیا۔

''ایک دن خوشونت سنگھ نے دورانِ گفتگو کہا: ''تمہاری سوانح کا کیا ہے، بس ایک حادثہ! لکھنے بیٹھو تو رسیدی ٹکٹ کی پشت پر درج ہو جائے''۔ رسیدی ٹکٹ شاید اس لیے کہا کہ باقی ٹکٹوں کا سائز بدلتا رہتا ہے لیکن رسیدی ٹکٹ کا وہی چھوٹا سا رہتا ہے۔''

(رسیدی ٹکٹ، امرتا پریتم، ص 11)

خوشونت سنگھ (مشہور مصنف، تاریخ دان اور نقاد) سے ہوئی اس گفتگو کی تاثیر میں امرتا پریتم نے بعد ازاں جب اپنی سوانح حیات لکھی تو اُس کا نام ''رشیدی ٹکٹ'' ہی رکھا۔

سچائی واقعی یہی ہے۔ انسانی زندگی کا سفر مختصر ہے کہ رسیدی ٹکٹ کی پُشت پر لکھا جا سکتا ہے۔ یہ بات تب سمجھ آتی ہے جب انسان زندگی کے آخری دور میں ہوتا ہے اور جب وہ اپنی زندگی پر غور کرتا ہے تو اُسے اوّل تا آخر اپنی زندگی بہت مختصر نظر آتی ہے۔

میری زندگی بھی اِسی رسیدی ٹکٹ کی مانند ہے۔ کتاب کے ان صفحات میں، میں اپنی اب تک کی حیات کے بارے میں کچھ لکھنا نہیں چاہتا کہ مجھے نہ امیری کا دعویٰ ہے اور نہ تعلیم یافتہ ہونے کا۔ جموں و کشمیر کے ضلع کشتواڑ کے ایک سادہ گھر میں 1963 میں میری پیدائش ہوئی تو ماحول وہی تھا جس میں ہمارے سماج کی اکثریت پلتی بڑھتی ہے۔ والد صاحب ایک کاری گر تھے جو لوہے کا کام کرتے تھے اور نرے ان پڑھ تھے۔ لیکن باوجود اِس کے مجھے شہرِ کشتواڑ کے سب سے قدیم

اور معروف اسکول اسلامیہ فریدیہ ہائی (آج کا ہائر اسکینڈری) اسکول میں داخل کرایا۔ اسکولی تعلیم میں میری دلچسپی معمولی تھی۔ البتہ اسکول میں مجھے بعض ایسے تجربے ہوئے جو میری فنی زندگی کا نکتۂ آغاز ثابت ہوئے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ میری زندگی ایسی نہیں کہ اُس پر کچھ لکھا جائے۔لیکن میں اپنی فنی زندگی پر کچھ ضرور لکھنا چاہوں گا کہ میں اِسے قُدرت کی جانب سے عطا کردہ ایک قیمتی عطیہ سمجھتا ہوں۔

بات یہ ہوئی کہ اسکول میں ڈرائینگ پیریڈ کے دوران ڈرائینگ کاپی پر میں طرح طرح کی تصویریں بنانے لگتا اور اساتذہ کو دکھاتا۔ وہ تصویریں شاید کچھ معنی اور مفہوم رکھتی تھیں کہ اساتذہ سے مجھے شاباشی ملتی تھی۔ اساتذہ سے شاباشی ملنے پر کچھ حوصلہ افزائی ہوئی تو میں نے بعض عظیم ہستیوں مثلاً علامہ اقبالؔ اور مرزا غالبؔ کی تصویریں بنائیں جو کلاس کی دیوار پر چسپاں کی گئیں اور اسکول سے میری فراغت کے بعد تک وہی رہیں۔ اُن تصویروں کو لے کر میرے دل میں کچھ تشنگی رہتی تھی۔ شاید میں چاہتا تھا کہ وہ تصویریں مجھ سے بات کریں، مجھ سے ہم کلام ہوں۔

ظاہر ہے یہ غیر ممکن بات تھی۔ لہٰذا اُن تصویروں اور رنگوں کے ساتھ وقت گزارتے مجھ پر غیر اطمنانیت طاری رہتی اور یہیں سے میری توجہ قلم اور کاغذ پر گئی۔ میں ٹوٹے پھوٹے الفاظ کاغذ پر ترتیب دیتا گیا۔ جو بات مصوری سے نہیں بن پائی، وہ شاعری سے بننے لگی۔ میں شعر لکھتا رہا اور سر دھنتا رہا۔ جو مجھے چاہیے تھا، وہ مل گیا۔ میرے تخیلات کو الفاظ مل گئے اور یوں میری شاعری کی ابتداء ہوئی۔

اسکول میں دسویں کا امتحان پاس کیا تو غمِ روزگار نے زندگی کے دروازے پر دستک دی۔ روزگار کے حصول کے لیے کوششیں شروع کیں۔ کوششوں کا صلہ یہ ملا کہ سال 1984 میں جموں کشمیر کے محکمۂ پولیس میں بھرتی ہوا۔ میری پہلی تعیناتی ضلع راجوری میں ہوئی جو علمی وادبی طور پر ایک ذرخیز علاقہ ہے۔ شہباز راجوروی، فدا راجوروی، صابر مرزا، خورشید بسملؔ، اقبال شال، خورشید جانم، شفیق احمد مسعود، مہاراج کرسنگھ ایشر، اسلم مرزا جیسے شعراءاِسی سرزمین کے سپوت ہیں اور ان سب سے مجھے فیض کا شرف بھی حاصل ہے۔

پولیس محکمہ اور ادبی دنیا، دو الگ الگ سوچیں ہیں۔ اِس محکمہ میں رہ کر شاعری اور ادبی سرگرمیوں کے لیے وقت نکالنا قدرے مشکل ہے۔ دن کے چوبیس گھنٹوں میں کبھی بھی آپ کو افسرانِ بالا کا حکم آسکتا ہے اور حکم کی تعمیل میں آپ کو اپنی ساری مصروفیات تج دینی پڑتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ مشاعروں اور ادبی محافل کے لیے وقت نکالنا دشوار ہوتا تھا۔ لیکن میرے وجود پر پولیس نوکری سے زیادہ میری ادبی دلچسپی حاوی تھی۔

ادبی دلچسپی میرے اندر کی آواز تھی۔ اندار کی آواز جب مادی اور دنیاوی چیزوں پر حاوی ہو تو اپنے ذوق کی تسکین کے لیے انسان وقت نکال لیتا ہے۔ میں باوجود مصروفیت کے مشاعروں اور اپنے ادبی دوستوں سے ملاقاتوں کے لیے وقت نکال لیتا تھا۔ یہی وہ دور ہے جب میرے فن کی تربیت ہوئی اور مجھے شاعری کے رموز و اسرار سمجھ آنے لگے۔

راجوری میں تعیناتی کے اُس دور میں مجھ پر شاعری کا جنون سوار رہا۔ اِسی جنون کو بھانپ کر راجوری میں میرے ایک دوست مرحوم شکور احمد رینہ نے میری ملاقات ڈاکٹر صابر مرزا صاحب سے کرائی، جو اُس وقت گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری اسکول راجوری میں اُردو کے استاد تھے۔ صابر مرزا صاحب اُردو، پہاڑی اور گوجری زبان کے جدید شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ موصوف نہایت مخلص اور شفیق انسان تھے۔ میں نے آپ سے مشورۂ سخن لیا۔ آپ نے میرے اشعار پڑھے، ضروری درستگی کی، میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے ماہنامہ شب خون، قرطاس اور آج کل اور دیگر رسائل کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔ میں نے یہ سب رسالے منگوانا شروع کیے اور یوں اپنے ذوق کی تسکین کرنے لگا۔ ان رسالوں کے توسط سے میری ادب فہمی میں اضافہ ہونے لگا۔ میرے اشعار میں پختگی آنے لگی۔ اِسی عرصے میں ”شب خون“ کے مدیر اور تنقید کی دنیا کے ماہتاب جناب شمس الرحمن فاروقی کو میں نے بعض خطوط لکھے جس میں شاعری اور ادب پر میرے کچھ استفسارات تھے۔ موصوف نے میرے خطوط کے مختصر جوابات لکھے جو ظاہر ہے میرے لیے رہنما اصول ثابت ہوئے۔

یہ اُسی دور کی بات ہے جب سال 1989 میں میرا پہلا شعری مجموعہ ”ریزہ ریزہ آئینہ“ کے

نام سے شائع ہوا جو میری غزلوں اور نظموں کا انتخاب تھا۔ کتاب کا اجراء جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں منعقد شدہ ایک ادبی کانفرنس (بعنوان" اردو کا ریاست جموں وکشمیر کی دوسری زبانوں سے رشتہ") میں سابق صدرِ شعبہ پروفیسر عنایت اللہ منظر اعظمی اور پنجابی ڈیپارٹمنٹ کی سینئر پروفیسر ڈاکٹر شرن کور کے ہاتھوں ہوا۔ اُس وقت پروفیسر ظہور احمد شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ یہ ظاہر ہے میرے ادبی سفر کا ایک خاص event تھا جس سے یقیناً میری حوصلہ افزائی ہوئی اور میرے ذوق کو اور تقویت ملی۔

اِسی دور میں شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کے فن میں میری دلچسپی پیدا ہوئی۔ میں نے اردو ادب کے نمائندہ افسانہ نگار مثلاً منٹو، بیدی، کرشن چندر اور دیگر افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مطالعہ کیا۔ مطالعے کے بعد مجھ میں بھی افسانے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے افسانے لکھنا شروع کیے تو ادبی دنیا میں اُنھیں پسند کیا جانے لگا۔ میری توقع سے بڑھ کر اُنھیں قبولِ عام حاصل ہوا۔ پیاسا شہر، ادھ جلے سگریٹ کا دھواں، کتاب جل گئی، سلگتے چنار، رت جگا، برفانی رات، بے نام رشتہ، سرخ پتے سبز پھول، آنسوؤں کا حساب، احساس کا کرب، اُمید کا گھاؤ، آہن گر، چناروں کے سائے، آخری گاہک، تیری آنکھیں میرے آنسو، میلی پرچھائی، یادوں کے گلاب......... میرے یہ سب افسانے ہند سماچار میں ہفتہ وار شائع ہوئے۔ یہ افسانے ماہنامہ بیسویں صدی، تعمیر اور دیگر رسائل میں بھی چھپتے رہے۔ گو کہ یہ سب افسانے پسند کیے گئے۔ لیکن افسانہ نگاری کے اِس فن کو میں مزید آگے نہ بڑھا پایا۔ شاید میری طبیعت شاعری کے لیے زیادہ موزون ہے۔

گزشتہ صدی کی آخری (90ویں) دہائی کا آغاز ہوا تو ریاست جموں وکشمیر ایک خون آشوب دور میں داخل ہوئی جس سے زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوا۔ ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ اسی ماحول میں میری تعیناتی مختلف جگہوں پر ہوتی رہی۔ کبھی میں کشمیر تعینات ہوا تو کبھی جموں میں، کبھی خطۂ پیر پنچال اور کبھی اپنے آبائی علاقے خطۂ چناب میں۔ پولیس ڈیوٹی نبھانے کے لیے میں جہاں بھی گیا وہاں اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر میں نے ادبی ماحول کو ڈھونڈنے کی کوشش کی اور

اپنے ذوق کی تسکین کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ اِسی ادبی ماحول نے مجھے ریاست کے قرب وجوار سے ادبی دوست دیے، میں ادبی محافل کا حصہ بنا اور میری ادب فہمی اور ادب شناسی میں تقویت آئی۔ شاید اِسی ماحول نے مجھے شاعری کے لیے موزون خیالات دیے جنھیں میں آج آپ کے سامنے لانے کی جسارت کر رہا ہوں۔

گزشتہ سال 2023 میں مجھے پولیس نوکری سے فراغت ملی۔ فراغت کیا ملی مجھے مصروفیت اور فراغت کا اصل مفہوم سمجھ آیا۔ ایک طرف سرکاری نوکری سے فراغت کی تقریب ختم ہوئی تو دوسری جانب مجھے اپنے لکھے ہوئے کلام کو جمع کرنے نیز اُسے شائع کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ گزشتہ ایک سال سے مجھے ایسی فرصت نصیب ہوئی ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اپنے پرانے کلام کو جمع کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے بہت کچھ نیا لکھا اور لکھے جا رہا ہوں۔ خیالات ایسے نازل ہو رہے ہیں کہ میں اِسے اللہ کے کرم سے تعبیر کرتا ہوں۔ مجھے شعر موزون کرنے کا جو تھوڑا بہت ہُنر ہے، اُسے میں اُسی ذاتِ کریم، مولائے رحیم کا عطیہ سمجھتا ہوں۔

زیرِ نظر مجموعہ آپ تک لانے میں، میں گزشتہ ایک سال سے مصروفِ عمل ہوں۔ میں اس عمل میں ہر گز تنہا نہیں ہوں۔ بزرگ شاعر اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ ادیب جناب کرشن کمار طورؔ کا میں صمیم قلب سے مشکور ہوں۔ آپ نے میرے کلام کو اوّل تا آخر لفظ بہ لفظ پڑھا اور مجھے بعض ضروری مشورے دیے۔ علاوہ ازیں میرے اِس مجموعے پر آپ نے اپنے قیمتی تاثرات بھی لکھے۔ نہایت ناشکری ہوگی اگر میں پروفیسر کوثر مظہری صاحب (شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ) کا ذکر نہ کروں۔ آپ نے میرے اِس مجموعے کو پڑھا اور اِس پر اپنے قیمتی تاثرات بھیجے جو شاملِ کتاب ہیں۔ میں پروفیسر سرور الہدیٰ (شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ) کا بھی ممنون ہوں، آپ نے بھی میرے کلام کو پڑھا اور اپنی رائے سے نوازا۔

اِس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں میرے لختِ جگر احمد توصیف قدس نے اہم کردار ادا کیا۔ توصیف شاعر نہیں ہے۔ لیکن ادب فہمی اور ادب شناسی کا جوہر اُس میں ضرور موجود

ہے۔توصیف نے میرے اِس مجموعے کو نہ صرف ترتیب دیا بلکہ کتاب پر ایک بسیط مضمون لکھ کر حقِ فرزندی ادا کر دیا۔توصیف ہندوستان کی معروف یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کے شعبۂ اُردو میں پی ایچ ڈی اسکالر کی حیثیت سے تحقیقی سرگرمیاں انجام دے رہا ہے۔ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے عزیز بھائی جناب عمر فرحت (نوجوان شاعر، مدیر ماہنامہ تفہیم) کو یاد نہ کروں۔آپ نے کتاب شائع کرنے کی بعض تکنیکی چیزوں سے مجھے آگاہ کیا نیز قدم قدم پر اپنے مشوروں سے نوازتے رہے۔

اپنی ادبی برادری کا ذکر کیے بغیر میری یہ گفتگو ادھوری رہے گی۔میری ادبی برادری اور میری شاعری ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔یہ میری ادبی برادری ہی ہے جس سے مجھے ہمیشہ کچھ نیا لکھنے کا حوصلہ ملا اور جس کی صحبت اور سنگت سے میرا شعری ذوق پروان چڑھا ہے۔یہ برادری طویل نہیں البتہ خاص ضرور ہے جن میں الفت کشتواڑی، پرویز ابن طیب، رحمت علی رحمت، اعجاز احمد زرگر، عبدالسلام احسن، ڈاکٹر شبیر احمد شبیر، گلاب سیفی، عبدالرشید جانثار، شبیر احمد فہمی، احمد ارسلان اور دیگر رفقائے کرام کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔مولائے کریم سے دُعا ہے کہ بزرگ شاعر جناب کرشن کمار طور کو لمبی عمر دے، میرے بیٹے توصیف کو علمِ نافع اور عملِ صالح سے نوازے اور میرے خیرخواہوں اور ادبی دوستوں کو سلامت رکھے۔

مجھے شاعر ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں ہے اور نہ میں فن کے رموز کی مہارت رکھتا ہوں۔ہاں البتہ اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کو لفظوں کی مالا میں پرو کر آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔یہی میرا اثاثہ ہے اور یہی سب کچھ میری رسیدی ٹکٹ کی پُشت پر لکھا ہے۔میں اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کو آپ کو پہنچانے میں کس حد تک کامیاب ہو پایا ہوں، اِس کا فیصلہ آپ کریں گے۔

✶✶

اکتوبر 2024
کشتواڑ، جموں وکشمیر

حمد

ادھر دیکھا اُدھر دیکھا یہاں دیکھا وہاں دیکھا
جہاں بھی جس طرف دیکھا تجھے سب میں نہاں دیکھا

اگر منظر میں بھی تو ہے پسِ منظر میں بھی تو ہے
تجھے ہی اے مرے مولا مکاں تا لا مکاں دیکھا

کہاں گنتی میں آتے ہیں تری قدرت کے سرچشمے
ہر اک جانب تری وسعت میں تجھ کو کن فکاں دیکھا

خیالِ سرمدی کو قید کرنا ہے بہت مشکل
عجب اک ربط لافانی دماغوں میں رواں دیکھا

ترے الطاف کا ذکر کہاں الطاف ہو پائے
فزوں تر عجز سے اُس نے تجھے ہر پل عیاں دیکھا

○○

فریاد (نعتیہ اشعار)

اشجار جل چکے ہیں نئے برگ و بار دے
باغِ نبی کو میرے خدا پھر بہار دے

بجھ جائیں جگنوؤں کے سبھی جھوٹے قمقمے
اللہ مرے نگر میں وہ سورج اُتار دے

ہیں بادباں دریدہ تو معدوم ناخدا
اِس جلتی آگ میں ہمیں اب تو کنار دے

دھندلا چکے ہیں آندھیوں کی سُرخ گرد سے
یہ شیشے اپنے عکس میں پھر سے اُتار دے

معصوم نو نہال بھُنے جا رہے ہیں سب
اب تو نگر میں پھر سے فرشتے اُتار دے

نفرت سے یہ زمین ہوئی ہے بہت سیاہ
عمر رضی اللہ عنہا و علی رضی اللہ عنہا کے دور کا پھر سے وقار دے

تعداد میں بہت ہیں مگر جھاگ کی طرح
کردار پھر سے غازیوں کو آب دار دے

الطافِ معجزہ ہی ضروری ہے اب کوئی
جو بجھ چکے ہیں دل اُنہیں اللہ قرار دے

OO

منقبت (دربارِ فریدیہؒ)

نہ میری رات کو مل پائے اب سحر کا سُراغ
وہ آج بانٹ رہے ہیں صدائے حق کے چراغ
رہے ہیں زیرِ نگیں تیرے ابرِ انور کے
بھنور ہو سوچ کے میرے تمہی ہو میرا دماغ
چناب بہتا رہا ہے جہاں سے آپؒ نے بھی
پلائی ایسے اخوّت چھلک نہ پائے ایاغ
چلے ہیں خوشیوؤں کے لفظ عاجزانہ لئے
بہ سوئے حضرتِ اسرارؒ کن صبائے فراغ
رہی ہے دنیا یہ زیرِ قدم عرب تا عجم
گئے جہاں بھی جلائے ہیں وحدتوں کے چراغ
وہ شاہ ہوں کہ گدا آپ کے غلام رہے
ہمارے وصل پہ ہیں آج اُن کے ہجر کے داغ
اسیرِ حلقۂ انوارؒ بھی ہوں میں الطافؔ
جلا رہا ہوں محبت سے اپنے دل کا چراغ

○○

مٹکے اُداس ہیں یہاں گاگر اُداس ہیں
پانی کی بوند بوند کو بنجر اُداس ہیں

چپو ہے غم زدہ انہیں دیمک نے کھا لیا
روٹھی ہے برف ٹین کے چھپر اُداس ہیں

تشنہ لبی سے اپنی روانی میں گم ہوئے
اک بوند بھی نہ دے سکے ساگر اُداس ہیں

بیٹھے ہوئے جو کھڑکی پہ طائر اداس ہیں
ست رنگی ناگ ہیں مِرے اطراف میں یہاں

از بر تھے جتنے سارے وہ منتر اُداس ہیں
الطاف سنہ غزہ کو کہیں دیکھ آئے ہوں

○○

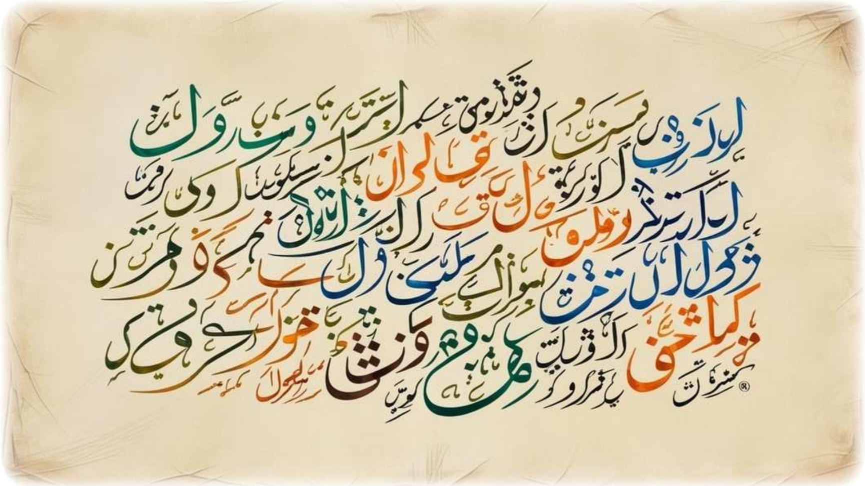

لفظوں کو تولنے کے تو اوزان ہیں الگ
نسوار کیسے تولیں وہ سامان ہیں الگ

اُونی لباس عظمتِ دستار ہم سے ہے
ہم لوگ اپنے دور کی پہچان ہیں الگ

قندیل بجھ رہی ہے شبِ غم طویل ہے
شاید اب ان کے آنے کے امکان ہیں الگ

تم وہ نہیں جو دستِ دعا میں تھے موجزن
شاید صدائے عشق کے میزان ہیں الگ

ملتے نہیں ہیں طاقوں میں رکھے ضرور تھے
اس عشق کے سنبھالے وہ گلدان ہیں الگ

پرہیز تجھ کو چاہیے لفظوں سے عمر بھر
الطافؔ سازِ عشق کے ارمان ہیں الگ

○○

پھول میں پتوں میں مسکائے لگتے ہو
میرے گلشن میں تم آئے لگتے ہو

دور ہوئے ہو جب سے تم اس دنیا سے
ہر پل بس میرے ہی سائے لگتے ہو

میرے دکھ کے کنکر چن چن کر اکثر
دامن میں اُن کو سمٹائے لگتے ہو

میرے کمرے کے خالی گلدانوں میں
تازہ پھول کہیں سے لائے لگتے ہو

تم سے ہر پل باتیں کرتا رہتا ہوں
تم میرے دل کے ہم سائے لگتے ہو

صحرا کی سلگتی راہوں میں تم ہر دم
اُڑتے ہوئے بادل کے سائے لگتے ہو

وقت کی تیز نگاہوں سے بچ کر اکثر
تم میرے کمرے میں آئے لگتے ہو

پیپل کے اک پیڑ کی چھاؤں میں آکر
پوجا کے کچھ پھول بھی لائے لگتے ہو

تم الطاف کبھی پھولوں کی الفت میں
چوٹ بھی کوئی دل پر کھائے لگتے ہو

○○

وقت گھر میں گزار چند پہر
زخم کر لے شمار چند پہر

کب وہ یارانِ وقت خواب ہوئے
کب تھی دیکھی بہار چند پہر

پھر تُو مجھ کو شکار کر لینا
زندگی دے اُدھار چند پہر

اِک مسافت نئی ہے پھر آگے
تھک کے بیٹھے ہیں یار چند پہر

حسن بھی عارضی تھا دنیا میں
عشق تھا اِک خمار چند پہر

کل نہ جانے ہو کون محفل میں
سُن لے بس ایک بار چند پہر

پھر کہاں فرصتیں ملیں الطافؔ
سی لے اشکوں کے ہار چند پہر

OO

آنسو ہی سہی دامنِ مژگاں سے نکل جا
وہ میرا نہیں، راہِ طلب تُو بھی بدل جا

یہ حسن کا پندار ہے کچھ دن کی امانت
گل خار بھی بن جاتے ہیں گلشن میں ٹھل جا

پتھر ہے اگر تُو ذرا ایسا بھی نظر آ
پہلو میں کبھی برف کی مانند پگھل جا

ناقوس کوئی پھونک رہا ہے جو ہوا میں
تو برسرِ پیکار اگر ہے تو سنبھل جا

مدت کی مسافت سے چلے آتے ہیں سب لوگ
کچھ دیر کہیں اور جگہ اب تو اجل جا

الطافِ شبِ غم میں سبھی ناچ رہے ہیں
تو ایسی خدائی سے کہیں اور نکل جا

OO

دل کا چنگ و رباب چھیڑا ہے
کسی نغمے کا خواب چھیڑا ہے

وقت جس کو کرے گا طے اک دن
عمر کا وہ حساب چھیڑا ہے

اُس نے مرہم لگا کے نشتر سے
زخم کا ہر شباب چھیڑا ہے

بات اُونچی اُڑان کی کر کے
میرے دل کا عقاب چھیڑا ہے

جس سے پردے میں گفتگو نہ ہوئی
اُس نے ہی بے نقاب چھیڑا ہے

زندگی کے سفر میں غربت نے
آتے جاتے جناب چھیڑا ہے

زخمِ دل کی کتاب کا الطاف
اُس نے پھر سے نصاب چھیڑا ہے

OO

پیار کی ترچھی لکیریں ترے جوبن کی طرح
لوٹتی ہیں مرے دل میں کسی ناگن کی طرح

یاد کترن کی طرح دل سے گزرتی ہے کبھی
کاٹتی ہے مری دیوار وہ سیلن کی طرح

اُون کی طرح سے کاتی ہے محبت اس نے
دور پھینکی مری چاہت کسی اُترن کی طرح

دور جب چھوڑ کے آتے ہو بہت اپنوں کو
یاد کرتی ہیں وہ قبریں تمھیں سوسن کی طرح

جھڑ چکے ہیں سبھی پتے ہے بدن اب تنہا
عمر کا پیڑ کھڑا ہے کسی پھاگن کی طرح

لے گئے ہیں سبھی بادل وہ یہاں سے الطافؔ
اب نہ برسیں گی یہ آنکھیں کبھی ساون کی طرح

OO

ہر رات ستاتا ہے بچھڑ کیوں نہیں جاتا
وہ خواب ان آنکھوں سے اُتر کیوں نہیں جاتا

سامان غمِ عشق گلی میں وہ اُٹھائے
تکتا ہے دریچے کو، وہ گھر کیوں نہیں جاتا

جپتے ہیں ترا نام، ہے قربت نہ جدائی
تسبیح کا یہ دانہ بکھر کیوں نہیں جاتا

آنکھوں کے دریچے میں شفق رنگ بھرے ہیں
یہ ہجر مرے دل سے اتر کیوں نہیں جاتا

فرصت نہ ملے گی تجھے مطلب کے جہاں سے
کچھ کام اگر ہے تو وہ کر کیوں نہیں جاتا

اک اور بھی منزل ہے ابھی راہ فنا کی
الطافؔ یہ ہو ختم سفر کیوں نہیں جاتا

OO

بدن کو ، برہنہ کر لے نہ تو اجل کے لئے
پہن لے زندگی باقی ہے جو بھی کل کے لئے

گھنیری رات کو چیرا تھا جس سحر کے لئے
لہو کا تیل جلایا ہے اس مشعل کے لئے

نوائے وقت کا ناقوس کہہ رہا ہے تجھے
حصارِ ذات سے باہر نکل تو پل کے لئے

کئی وسیلوں سے تعمیر ہم نے کی اس کی
چنے ہیں شعر بہت ہم نے اک غزل کے لئے

ترقیوں نے اگائے مکان کھیتوں میں
ہمارے بیل ہیں بے کار اب تو ہل کے لئے

تھے اُس میں خواب بھی الطافؔ تیرتے تیرے
وہ جھیل روٹھ گئی ہے جو تھی کنول کے لئے

○○

اب کوئی تازہ زخم لگ جائے
جو کیا ہے وہ جرم لگ جائے

ہے چھپانا اگر چھپا لے غم
چہرے پر اب نہ بھسم لگ جائے

جو خطا ہے وہ ہو معاف یہاں
روح کو میرا جسم لگ جائے

دل میں اللہ کرے کہ اب پھر سے
یہ محبت کا تخم لگ جائے

مجھ کو الطاف یہ دعا ہے مری
اب کہیں تیری چشم لگ جائے

○○

دل اِدھر ہے مگر اُدھر تُو ہے
آنکھ میری ہے اور نظر تُو ہے

ہے یہی کشمکش تو برسوں سے
کس طرف دیکھیں اب کدھر تو ہے

چاک دامن ہوا ہے ترے لئے
اے رفوگر مرے کدھر تو ہے

زہر امرت سمجھ کے دے مجھ کو
پی ہی لوں گا بتا جدھر تو ہے

چند سانسوں کی جستجو میں یہاں
ہر دعا کا مرے اثر تو ہے

یہ مرا گھر کبھی نہ خالی تھا
تو نہیں ہے، یہاں مگر تو ہے

پھر سے اُترے گا چاند آنگن میں
پھر سے الطاف آس کا گھر تو ہے

OO

وہ جو مل جائے تو پھر کیا بات ہے

دم نکل جائے تو پھر کیا بات ہے

مت تم اپنے ابرو کو کھینچو ابھی

تیر چل جائے تو پھر کیا بات ہے

جب تلک ہے وہ نظر مٹی ہیں ہم

خاک رُل جائے تو پھر کیا بات ہے

داغ تم دیتے رہے بس ہجر کے
زخم جل جائے تو پھر کیا بات ہے

تم کو آنا ہے فقط اب سائے میں
دن جو ڈھل جائے تو پھر کیا بات ہے

ریت کی مانند مٹھی میں ہے وقت
یہ پھسل جائے تو پھر کیا بات ہے

ناز ہے الطافؔ کو جس پر بہت
دل بدل جائے تو پھر کیا بات ہے

○○

درونِ قلب ہمارا تھا اور کیا تھا وہ
محبتوں کا ہی مارا تھا اور کیا تھا وہ

اگرچہ وقت نے اس پر ہیں تہمتیں رکھیں
وہ شخص جان سے پیارا تھا اور کیا تھا وہ

جو نغمہ گایا تھا بربط پہ میرے اشکوں نے
وہ غم ہی سارا تمہارا تھا اور کیا تھا وہ

خلوص کیا ہے محبت کی منزلیں کیا ہیں
شعورِ عشق سنوارا تھا اور کیا تھا وہ

لباس میرا ہی الطافؔ وہ بنا برسوں
خیال اس کا ہی پہنا تھا اور کیا تھا وہ

وہ پگلی تھی یا اک شوخ سی لڑکی تھی
پیاسے ہونٹ تھے سوکھی آنکھ کی پتلی تھی

پوری رات کے چاند سے باتیں کرتی تھی
گھر میں دن بھر تنہا تنہا رہتی تھی

وہ تو دھوپ کی گرمی سے کتراتی تھی
اور سائے کے خوف سے اکثر ڈرتی تھی

اُس کے دامن میں ہی سارے موسم تھے
برف تھی اور ساون کی تتلی تھی

چھین نہ لے مسکان کوئی میرے لب سے
میرے ہنسنے سے اکثر رو پڑتی تھی

بن کے لو میرے لکھنے کی خاطر وہ
موم سی نازک شب بھر روز پگھلتی تھی

مجھ کو دور اُفق کی جانب جاتے ہی
ٹوٹ کے وہ بے طرح سے پھر روتی تھی

وہ الطافؔ چھپا کر خود کو چوری سے
میرے دل کے اک کمرے میں بیٹھی تھی

OO

مشقتوں سے بس اک نان اب وہ لایا ہے
سلگتی دھوپ میں وہ کتنا بھیگ آیا ہے

اُبلتے آبلوں نے اور توکلات نے بھی
پیمبروں سے ترا سلسلہ ملایا ہے

بچھڑتی سانس کی ڈوری نے تیرے آنے سے
گرفتِ شام سے سورج نکال لایا ہے

وہ سخت جان ہے تشنہ لبوں کو صحرا میں
وہ بادلوں کی طرح بانٹتا سا سایا ہے

بِکھر گیا میں لمحوں میں منقسم ہو کر
ستارے بانٹتے خوابوں سے درد پایا ہے

رسوئیوں میں بھی الطافؔ وہ مسلماں ہے
لگا ہے بُو سے وہ اب بھی مرا ہم سایا ہے

○○

بچائے رکھا ہے ہم نے جہاں کی نظروں سے
تمہیں سُروں میں پکارا ہے اپنی غزلوں سے

تمہاری ہجر زدہ شمع سی ان آنکھوں کا
پگھلتا موم ٹپکتا ہے میری پلکوں سے

یہ لوگ اب تری فطرت سے آشنا تو ہوئے
میں تجھ کو جان کے رویا ہوں کتنے برسوں سے

پلایا مجھ کو میری ساری چاہتوں کے عوض
وہ زہر تھا تری فطرت میں نسلوں نسلوں سے

ہمارے کھیت میں بارود بو گئے ہالی
کھلے ہیں آگ کے دانے ہماری فصلوں سے

بھلا دیا ہے گلی گھر مکان سب الطافؔ
وہ پوچھتا ہے پتہ میرا، مری نظموں سے

○○

ہوائیں سر کو دھنیں ابر کڑ کڑاتا ہے
محاذِ جنگ کی جانب یہ کون جاتا ہے

وہ اپنی مٹھیوں میں رکھتا ہے بجلیوں کی لو
عدو کے ظلم سے جو گلستاں بچاتا ہے

محبتوں کے چراغوں میں تیل الفت کا
ہے کوئی روز جو دہلیز پر جلاتا ہے

غزہ میں آج بھی سفاک امن کا دشمن
دیے حیات کے ہر روز ہی بجھاتا ہے

ہے ایک جو تہِ افلاک ہے بے گور و کفن
اک اس کا بھائی ہے جو محفلیں سجاتا ہے

کبھی جو پیار کی محفل کا عادی تھا الطافؔ
اُداس گیت وہ بربط پہ آج گاتا ہے

OO

اشعار مرے دل میں بسانے کے لیے تھے
سب جانِ غزل تجھ کو سُنانے کے لئے تھے

جس خط کو سخن سنج سمجھ بیٹھا تھا تیرے
الفاظ تو وہ سارے لُبھانے کے لئے تھے

وہ حور سا پیکر جسے سمجھا تھا ہے میرا
وہ خط، وہ خدوخال زمانے کے لئے تھے

تا عمر جنہیں دل میں بٹھانا تھا یہاں پر
وہ دن وہ حسیں سال نہ آنے کے لئے تھے

آنچل میں سجائے ہوئے لمحوں کا وہ بچپن
وہ سارے کھلونے تو سجانے کے لئے تھے

وہ لے گیا ہے گھر سے پتنگے بھی دیۓ بھی
یادوں کے وہ چراغ جلانے کے لئے تھے

الطافؔ جو رومال وراثت تھے ہماری
وہ آئینے کی گَرد مٹانے کے لئے تھے

○○

یہ حادثہ بھی مری جاں کبھی تو ہونا تھا
کہ مجھ کو ٹوٹ کے تنہائیوں میں رونا تھا
وہ پھول جو بھرے گلشن میں سب سے پیارا تھا
بدلتی رت میں اُسے باغ سے تو کھونا تھا
وہ نیند تھی مری جاگتا یا کہ سویا تھا
وہ خواب خواب تھا اس کو تو صرف ہونا تھا
چلو یہ اچھا بُرا ہم نے خود کو اُوڑھ لیا
دمِ قضا کے لئے یہ بھی اک بہانا تھا
غلاف تھا کوئی الطاف تیری الفت کا
کہ جس کو کھول کے اب عمر بھر کو سونا تھا

OO

وہ اک لہار تھا ہاتھوں کے چھالے بولتے ہیں
کہ بکتروں میں ہمارے جیالے بولتے ہیں

یہ مخبروں نے چھپائی تھیں ساری خبریں اب
جو بُن رہے تھے یہاں سارے جھالے بولتے ہیں

محبتوں کی زباں تھی کبھی زمانے میں
مگر ہے وقت کہ سارے نرالے بولتے ہیں

پرندے شوق سے پالے تھے دل کے کمرے میں
جو پر لگے تو ہمارے ہی پالے بولتے ہیں

متاعِ چین و سکوں لوٹ کر گیا ہے کوئی
یہ دل کا چور ہے سارے ہی تالے بولتے ہیں

نوید ہے سرِ افلاک صبحِ نو کی سنو
اذاں ہوئی ہے یہ سارے شوالے بولتے ہیں

لہو کے بُلبُلے اُچھلے ہیں اور اُچھالے گئے
غزہ کے شہر میں خوں کے پیالے بولتے ہیں

صدائے شکر میں الطافِ آنسوؤں کا نمک
وہ ایک وقت کے گھر میں نوالے بولتے ہیں

OO

تمہاری یاد کے گملوں میں گل کھلے ہوں گے
تو پنکھڑیوں کے یہاں لب بھی اب ملے ہوں گے

تمہارے ہاتھ سے یہ آئینہ نہیں ٹوٹا
یہ میری شکل بکھرنے کے سلسلے ہوں گے

ہمیں بھی اُن سے شکایت تھی بے وفائی کی
اُنہیں بھی ہم سے محبت کے کچھ گلے ہوں گے

چلو کہ اب کی بہاروں میں خارِ سوزن سے
دریدہ دامنوں کے چاک تو سلے ہوں گے

ہیں جن پہ بیلوں کی مانند آیتیں الطاف
وہ کل کے خواب وہ اجداد کے قلعے ہوں گے

OO

یہاں وہ جیب میں یوں جھانکتا ہے
مری عمروں کی پونجی مانگتا ہے

مصور رنگ بھرنے میں لگا تھا
ہے اب تصویر جس کی ہانپتا ہے

چلوں گا ساتھ میں خاموش ہو کر
میں وہ سگ ہوں نہیں جو بھونکتا ہے

نکلتا ہوں نفس کی آگ سے جب
مرے بچوں کا کل پھر جھونکتا ہے

یہ ہر دن نت نئے پھولوں کو لے کر
تری زلفوں میں کوئی ٹانکتا ہے

کوئی نادیدہ لفظوں کے قلم سے
تخیل کے یہ ریوڑ ہانکتا ہے

ہیں سب دیمک زدہ لاؤں کہاں سے
مرے بچپن کے خط وہ مانگتا ہے

کوئی الطافؔ ہے سائے کی مانند
مرے کمرے میں اکثر رینگتا ہے

OO

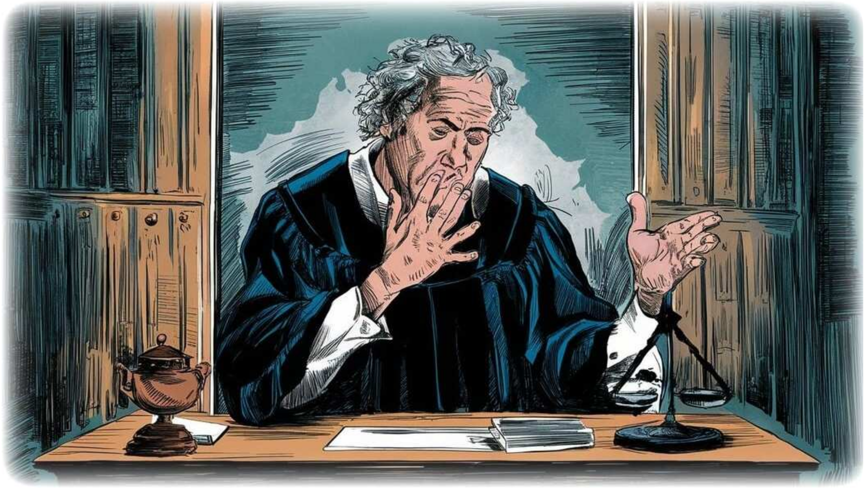

منصف ہیں جو فیصلے سے اپنے دور ہے
دل اور خرد کی راہ میں کوئی ضرور ہے

کتنے سنہرے رنگ کے لکھے ہوئے ملے
کیا زرگری کا قبر میں اس کو غرور ہے

لبریز ہے تجوری تری اور میں فاقہ کش
تو ہی بتا دے مولا یہ کس کا قصور ہے

لفظوں میں اب کے ایسا نشہ ہے کہ کیا کہوں
اشعار کہتے کہتے غضب کا سرور ہے

شاید مری انا کی کسی نے کی مخبری
خیراتِ عشق بانٹتے وہ مجھ سے دور ہے

تم موسموں کے ساتھ بدلتے ہو پیرہن
کھدر میں سال بھر ہمیں آتا سرور ہے

تو نے الگ ہی آنکھ کی بستی بسائی ہے
یہ میرا خواب تیرے نگر سے تو دور ہے

الطافؔ میرے عشق کی وہ کیسی لاج تھی
جو ہو سکا نہ میرا وہ خود سے بھی دور ہے

○○

کہاں تپتے سے صحرا میں اُبل آئے گا پانی اب
کنویں کھودے محبت کے، عبث ہے وہ کہانی اب

طوالت اور ہو جائے گی سائے ساتھ چھوڑیں گے
نہ سورج ہی پلٹ آئے گا، نہ گل کی جوانی اب

نہ سایہ ہے شجر کا اب نہ کوئی آب و دانہ ہے
میرے اُڑتے پرندے کی یہی ہے زندگانی اب

یہی ہے مصلحت ساری عداوت کی مرے آگے
نہ وہ آئے نہ میں جاؤں یہ دل میں ہم نے ٹھانی اب

ترقی یافتہ تہذیب کے سانچے میں گھر ڈالا
زباں تھی کل تلک گھر میں، مگر ہے بے زبانی اب

یہ پوچھو بے صدا سے، کیا صدائے لفظ ہوتی ہے
جہاں بے خوف نعرہ تھا وہاں ہے پیش مانی اب

اُنھیں میرے حوادث سے بھلا الطاف کیا لینا
یہ فہم و دل کی ساری جنگ، کیا تم کو سنانی اب

OO

قریبِ صبح وہ شمع کی لو کا پھڑ پھڑانا بس
ہَوا جب روٹھ جاتی ہے تو سانسوں کا بھی چلنا بس
ادھورا میں، نہ تم سالم، یہ کیسا ہر طرف عالم
محبت ہے یہی بے آب مچھلی کا تڑپنا بس
میں اپنے نام کی تختی لگا کر کیا کروں گھر میں
ہے طے رشتوں کا مٹنا، شان وشوکت کا بدلنا بس
جہاں تک ہو سکا کمرے کو روشن کر دیا اُس نے
یہ چاہت شمع کی تھی اور اسے تو تھا پگھلنا بس
محبت میں بنا اس کے بھلا الطاف کیا ہوتا
وہ خوشبو تھی اُسے مل کر ہوا میں تھا بکھرنا بس

○○

بند ہیں ہر سمت در میں کیا کروں
درد کے تنہا نگر میں کیا کروں

میں طرب گاہیں سجا لیتا مگر
دل ہے غم کا اب نگر میں کیا کروں

بند ہیں اب ان میں خوابوں کے سراغ
تیری آنکھیں جھانک کر میں کیا کروں

بے لباسی ہے مری تقدیر میں
پتے جاتے ہیں بکھر میں کیا کروں

میں نے پنگھٹ کے اِدھر ڈھونڈا بہت
پیار کی گاگر اُدھر میں کیا کروں

منتظر ڈولی کا ہے ساجن بہت
رُک نہیں سکتا سفر میں کیا کروں

دل ہی جب مائل نہ ہو تیری طرف
تو بکھر یا پھر سنور میں کیا کروں

غرق ہے وہ عہد نامہ اب یہاں
لفظ ہیں آنسو سے تر میں کیا کروں

میرے اندر کر لیا سورج نے گھر
تو بھی پگھلے گا مگر میں کیا کروں

وہ جو آوارہ منش الطافؔ تھا
وہ تو ہے اب اپنے گھر میں کیا کروں

○○

آگ میں پھر سے اُتر کر کیا کروں
شہر سے تیرے گزر کر کیا کروں

اب وہ راہیں اور تکیے ہی نہیں
تیری گلیوں میں گزر کر کیا کروں

جب وہ خوشبو سے کنارا کر گئیں
میں ہواؤں میں بکھر کر کیا کروں

جب وہ آنچل سے انھیں پونچھے نہیں
آنکھ میں یہ غم کو بھر کر کیا کروں

جب چراغوں نے ہی دم توڑا تو پھر
دل کی بستی میں ٹھہر کر کیا کروں

جب تری آنکھوں نے پلکیں بند کیں
میں بھنور سے پھر اُبھر کر کیا کروں

جب یہی ہے زندگی الطافؔ تو
میں محبت میں سدھر کر کیا کروں

OO

ہجر ہو ایک طرف پھولوں کے ہوں ہار الگ
ہم نے رکھا ہے مزاروں سے تو یہ یار الگ

ہم نے دیکھا ہی نہیں تھا کبھی گرتا تارا
جیسے دنیا میں ہو بیٹھا کوئی لاچار الگ

جیسے توڑا ہو کسی نے کوئی پتھر تجھ میں
سانس بے ربط تری بات کی تکرار الگ

تھی پسِ پردہ کوئی چوٹ وگرنہ یوں تو
دانش و عقل کے تو ہوتے ہیں معیار الگ

چاہنے والے ہیں ہم لوگ زمانے میں یہاں
کیا ضروری ہے مرے سر رہے دستار الگ

تم روایت، نہ ہو جدت، نہ ہو مابعد جدید
پھر تمہیں کیسے کہیں آج کے معمار الگ

ہم ہیں الطاف یہ الطاف کے موسم ہم پر
یوں کرو ہو نہ محبت میں کوئی یار الگ

○○

تو محو فکر میں ہے میری کائنات پر
ہوتا نہیں ہے کچھ بھی تری خواہشات پر
تیری انا کے دوڑتے گھوڑوں کا کیا کریں
آجائیں گے یہ خود ہی کبھی راہِ راست پر
نخوت تمہیں یہ فہم کی کر دے گی بے نقاب
دنیا نہیں ہے تیری بچھائی بسات پر
ہاتھوں میں لہو رنگ وہ دیکھو تو غور سے
نادم رہو گے دیر تلک اپنی ذات پر
الطافؔ چھو نہ پائی تمہیں چاندنی کبھی
تم دھوپ میں چلے کسی تپتی پرات پر

○○

کوئی تھا جو یہاں سے جا رہا ہے
مری سانسوں پہ نوحہ گا رہا ہے

لباسِ روح پہناؤں تجھے میں
مگر کیا تو کبھی مرا رہا ہے

وہ رُوٹھا تھا مجھے دیکھا ہے ہنس کر
تسلی سے رُلایا جا رہا ہے

وہ آئینے گلی میں بیچتا تھا
جو اپنی شکل سے پچھتا رہا ہے

برائے نقد وہ سیلن کی صورت
مرے لفظوں کو کھایا جا رہا ہے

منافق بزم میں ، وہ میرا ناصح
خود اپنے آپ سے شرما رہا ہے

ہمارے گاؤں کا خاموش دریا
نگر میں اب ستایا جا رہا ہے

یہاں الطاف، ایسے ہیں بٹیرے
بدن پل میں چھپایا جا رہا ہے

○○

ریت مٹھی میں تھی پوروں سے گرایا کیوں ہے
تو نے مجھ کو بھرے صحرا میں جلایا کیوں ہے

روز منظر وہی آتے ہیں بھلاتا ہوں جنھیں
آ کے خوابوں میں مجھے تو نے ستایا کیوں ہے

تو نے جب دور کہیں اپنی بسالی دنیا
دل کے کمرے میں گیا وقت پھر آیا کیوں ہے

جب ہے جاری کسی صحرا میں مری دریا دلی
روح کا ہانپتا آہو مرا پیاسا کیوں ہے

جیب خالی ہے تو یہ شوق بھی مر جائے گا
عشق کا سودا تری بزم میں مہنگا کیوں ہے

وہ جو صدیوں سے رہا دشتِ نوردی میں مگن
غیر کا ہو کے مجھے جان سے پیارا کیوں ہے

وہ جو الطاف گئے روز ملا تھا مجھ کو
اجنبی ہو کے بھی لگتا ہے وہ اپنا کیوں ہے

OO

لہولہو ہے آسماں یہ شام زلفِ یار ہے
ہوا میں زہر ہے یہاں صبا بھی اشک بار ہے

ہوا کے رُخ پہ بادلوں نے چادریں ہی تان دیں
سلگتی آہ سے یہاں تو سانس میں غبار ہے

یہ کیا ہوا کہ آدمی کی صورتیں بدل گئیں
بکھر چکا ہے کرچیوں میں چہرہ داغدار ہے

غرور کا سحر تا رہے گا کب تلک بھلا
یہ سحر ٹوٹ جائے گا بس اس کا انتظار ہے

نہ جی سکوں گا ایک پل تمہیں بھی اس کی ہے خبر
کہ دور میرے شہر سے یہاں ترا دیار ہے

چلے گئے ہو جب سے تم یہ ڈھلتی دھوپ کی طرح
یہ دل تمہارے واسطے اداس بے قرار ہے

OO

حیات کا ایک پل یہاں پر، جیا تھا شاید جیا نہیں ہو
اُداس صحرا کی ریت پر گل کِھلا تھا شاید کھلا نہیں ہو

جو وقت کی گردشوں میں گھوما سبھو کو چھوڑا، لہو کو چوما
وہ چاند کی بستیوں میں کل شب، ملا تھا شاید ملا نہیں ہو

وطن کی یادوں میں ہم نے اکثر بہائی آنکھوں سے آبشاریں
وہ یار گلیوں کے جن سے برسوں گلہ تھا شاید گلہ نہیں ہو

تمام چہرے اُداس نسلوں کے، اپنی پشتوں کو دیکھتے ہیں
جو سب کی قسمت میں لکھ دیا ہے، مٹا تھا شاید مٹا نہیں ہو

پھریرا امن وسکوں کا ہم نے، کیا تھا جو نصب اس زمیں پر
علم اک ایسا مرے جواں سے، اُٹھا تھا شاید اُٹھا نہیں ہو

اُمید تھی یہ ہماری کشتی، کرے گا روشن سبھی جہاں کو
وہ زندگی کا دیا ابھی تک، جلا تھا شاید جلا نہیں ہو

کٹی ہیں جبیں کہ اب ہیں ثابت، ہے کرنا اس کا تو فیصلہ ہے
دکان اگلے پڑاؤ پر ہے، ملا ہو شاید ملا نہیں ہو

وہ میرے الطاف کی شباہت، کسی کے موسم نے چھین لی ہے
وہ چہرہ اب تک بھی آئینوں میں، چھپا تھا شاید چھپا نہیں ہو

OO

عمر کی چائے تو پی لی ہے ترے خرچوں میں
زندگی ڈوب چکی ہے یہاں بس قرضوں میں

تو مجھے بھول چکا ہے یہ ہواؤں نے کہا
میں تجھے سوچ کے جیتا ہوں ابھی عرصوں میں

ایک پل کے لئے ٹھہرایا جہاں تھا تم نے
ایک مدت سے ہوں بیٹھا میں اُنہی رستوں میں

یہ صحیفے مجھے کام آئیں گے ماضی کے بہت
ایک لکڑی کا قلم ہے ابھی اُن بستوں میں

متقی کون وہاں ہے یہ خبر ہے سب کو
ہم نے مستی بھی بہت کی ہے اُنہی مستوں میں

وہ جو الطافؔ دعا سے ہے پریشان بہت
یہ سزا اس کو ملی ہو گی کئی عرصوں میں

○○

یہ دل کی دھڑکن پہ ساز بجتے تری ہی خاطر ترے رہیں گے
ہیں درد کے میرے سارے نغمے تری ہی خاطر ترے رہیں گے

کھلی ہیں پھولوں کی پتیاں سب، تری جدائی کے زخم سے اب
لہو بہ رنگِ چمن جھلکتے، تری ہی خاطر ترے رہیں گے

یہ نقش تیرے قدم کے اب بھی ہر اک جگہ ضوفشاں ہوئے ہیں
مری گلی کے وہ سارے رستے، تری ہی خاطر ترے رہیں گے

ہمیں تو اُن سے اُمید یہ ہے، ہو کچھ بھی تیری ہی خیر مانگیں
دُعا کو جو ہیں یہ ہاتھ اُٹھتے، تری ہی خاطر ترے رہیں گے

ہوں بارشوں کی پھوار تجھ پر، یہ دھوپ تجھ کو نمود بخشے
چمکتے تاروں کے سارے نقشے، تری ہی خاطر ترے رہیں گے

بہار چومے ترے قدم کو، خزاں کے رنگوں سے تو نہ سہمے
یہ رہتی دُنیا کے کھلتے غنچے، تری ہی خاطر ترے رہیں گے

یہ تیرے الطاف کی صدائیں، زمیں سے تا عرش گونجے ب
ہوں معتبر سارے لفظ اب کے، تری ہی خاطر ترے رہیں گے

○○

ہوئی ہے ہم سے خفا وہ ہوا کئی دن سے
کواڑ ہوگئے ہیں بے صدا کئی دن سے

کسی کے رُخ کا ہے پرتو کہ سانس کی ہے لہر
گلوں سے پوچھتی ہے یہ صبا کئی دن سے

نہ کوئی روشنی آئی نہ جھانکا سایہ کوئی
دریچہ ہوتا رہا نیم وا کئی دن سے

ہے شہرِ دل میں تماشہ یہ سانس کا کیسا
ہَوا کا کھیل ہی چلتا رہا کئی دن سے

سنا رہا ہے محبت کی داستاں وہ شخص
گلی کے موڑ پہ بیٹھا ہوا کئی دن سے

وفا کو زر کے ترازو میں تولتا ہے بہت
جو کہہ رہا ہے مجھے بے وفا کئی دن سے

یہ کیسی چپ سی الطاف کو لگی ہے یہاں
نہ سانس لی ہے نہ کی ہے صدا کئی دن سے

○○

وہ موم سے بدن کی بنائی اُسی کی ہے
میرے تخیلات کی رانی اُسی کی ہے

لفظوں کی ہو بساط کہ قرطاس کی غبار
ٹپکی ہوئی قلم سے سیاہی اُسی کی ہے

اِک چاندنی کی آس میں کاٹی سیاہ شب
آنکھوں میں خواب، نیند بھی لائی اُسی کی ہے

یہ عہد تھا ترا کہ میں آزاد ہی رہوں
دل کے قفس سے میری رہائی اُسی کی ہے

بادل یہ پھر رہے ہیں سرِ آسمان جو
چُنری ہَوا کے دوش پہ چھائی اُسی کی ہے

تاروں کی کہکشاں ہے ہَوا مُشک بار ہے
وہ یاد کی پری تھی وہ آئی اُسی کی ہے

وہ کون ہے وہ کیا ہے یہ میں جانتا نہیں
دل کی زمیں پہ چھائی خدائی اُسی کی ہے

الطافؔ زندگی کو نہ حیرت سے دیکھ تو
جیسی بھی تھی یہ ہم نے گزاری اسی کی ہے

OO

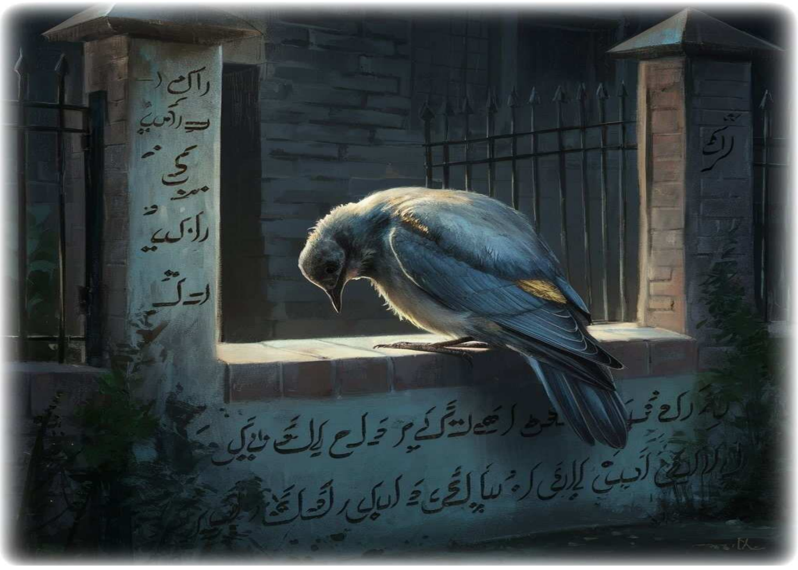

دیکھنے میں مرے اشعار اب کچھ بھی نہیں
ہیں فقط سوچوں کا انبار اب کچھ بھی نہیں

بولتی ہے قید کے بے پر پرندے کی زباں
ایک بے ربط سی جھنکار اب کچھ بھی نہیں

میں ترا کچھ بھی نہیں تو ہی بتا اے دِل مِرے
تجھ سے ہونے کا ہو اقرار اب کچھ بھی نہیں

چہچہاتی تھی وہ جو چڑ مرے آنگن میں
تھا اسے درد سے بھی پیار اب کچھ بھی نہیں

اب طبیبوں سے دوا تیری نہیں آئے گی
عشق کا تو ہوا بیمار اب کچھ بھی نہیں

وہ جو لاٹھی پہ ٹکائے ہوئے جسم آتا ہے
ہے گئے وقتوں کا دلدار اب کچھ بھی نہیں

تجھ کو الطاف یہ ہوتی ہے ندامت کیسی
تو ہے اک وقت کا فنکار اب کچھ بھی نہیں

○○

میں تنہا تھا میں تنہا ہوں اکیلا ہی رہوں گا اب
ترا شیشے کا برتن ہوں میں ٹوٹا ہی رہوں گا اب

مجھے اے وقت تو کوٹھے سے اب کیسے اُٹھائے گا
میں تیرے پاؤں کی جھنکار بجتا ہی رہوں گا اب

کبھی بادل کبھی گیسو ہواؤں کوہ ساروں میں
ہوں تیرے لفظ کی خوشبو بکھرتا ہی رہوں گا اب

نہیں ملتا بہت ڈھونڈا تمہاری شکل کا پرتو
تمہارا بن کے سینے میں دھڑکتا ہی رہوں گا اب

کبھی تکتی ہے سناٹوں میں تیری یاد کی آنکھیں
تجھے سُنتا ہوں بے آواز سُنتا ہی رہوں گا اب

محبت کے چراغوں کو میں ہر صورت یوں ہی اکثر
ہواؤں میں جلا تا ہوں جلاتا ہی رہوں گا اب

مرے الطاف پژمردہ گلوں سے سیکھ لے جا کر
کہ خاروں کا نہیں کوئی میں کانٹا ہی رہوں گا اب

OO

چاہتیں گل سڑ گئیں، شلفوں پہ یہاں، تیرے بعد
آج ٹوٹی ہے، یہ شیشوں کی دکاں تیرے بعد

تو نے رکھے تھے مرے کمرے میں چاہت کے چراغ
وہ عیاں ہیں کہ نہاں اب ہیں کہاں تیرے بعد

چھت میں تھے گھونسلے تھا شور ابابیلوں کا
مل چکی ہے مجھے اب سب سے اماں تیرے بعد

تیرتی رہتی ہے تو آنکھوں کی ابھی جھیلوں میں
ہے مگر دریا کے لب پر یہ فغاں تیرے بعد

تجھ سے بچھڑا تو ہواؤں میں ہی تحلیل ہوا
اب سمٹنے کا گماں بس ہے گماں تیرے بعد

تم مری آنکھوں سے ہی اس کی گواہی لینا
میں نے پہنی ہے تری ساری تکاں تیرے بعد

جانِ الطافؔ یہ لفظوں کی مہک دار کتاب
تیری خاطر ہے مری کل کے نشاں تیرے بعد

OO

جوشِ دمِ طفلانِ مناسب میں ابھی ہو
ناپختہ بہت حسبِ مراتب میں ابھی ہو

ترتیب معین ہے ستاروں کی ازل سے
تم چرخ شناسی کے مطالب میں ابھی ہو

محتاط ضروری ہے رفیقوں سے بھی اے دل
تم حلقۂ یاراں کے تخاطب میں ابھی ہو

تم قامتِ فن میں ہو سفیدے کی ہی مانند
بے سایہ ہوئے اپنے اقارب میں ابھی ہو

الطاف ترے غم سے چرائی تھی جو اک شام
شاید وہ سیاہی بھی مری نب میں ابھی ہو

OO

تھیں عہدِ طفلی کی ساتھی جو لڑکیاں بچھڑیں
سمندروں سے جو لائے تھے سیپیاں بچھڑیں

میں جھانک سکتا تھا جن سے بس اس کے کمرے میں
مرے قریب کی وہ ساری کھڑکیاں بچھڑیں

جو ذرہ ذرہ تھیں الفت کی ایک شورش میں
تمہاری یاد کی وہ ساری کرچیاں بچھڑیں

تمہاری یاد کے آنسو تو کب کے خشک ہوئے
ادھوری تھیں جو محبت کی ہچکیاں بچھڑیں

چراغ جلتے تھے جن پر سدا ہی شام گئے
تمہاری جھیل سی آنکھوں کی پتلیاں بچھڑیں

بڑی سی بالیاں کانوں میں اور کشادہ فرن
اُسی لباس میں لپٹی یہ وادیاں بچھڑیں

وہ جب سے روٹھ گئے میرے باغ سے الطاف
گلاب چہروں پہ منڈلاتی تتلیاں بچھڑیں

○○

وہ دن تھے کہ تم نے مجھے ٹالا تھا ہنسی سے
اب رو کے بلاتے ہو مجھے پار ندی سے

جس غم کی سیاہی سے بچاتا رہا دامن
پھر وقت نے ملوایا ہے سو بار اُسی سے

مجھ سے تو محبت کے نگر روٹھ چکے ہیں
تُو اپنی سُنا ، تو نے تو پائی تھی خوشی سے

ہوتا رہا پندار عیاں اُس کے سخن کا
درکار یہاں معجزے ہیں کتنے ولی سے

جلتی ہوئی سینے کی فقط آگ بجھا کر
ہم نے تو یہاں بات بہت کی ہے کسی سے

آسان یہاں تم پہ ہو یہ گردشِ دوراں
کرنی ہے محبت تو کرو میرے نبی سے

الطاف یہ دنیا کسی صحرا کی طرح ہے
بس آگ ہی اُگتی ہے یہاں تشنہ لبی سے

OO

یقیں کی اک نئی تمہید ہوگی
اسیروں کی قفس میں عید ہوگی

رُخِ سہ رنگ ہم سے کہہ رہا ہے
کہ رنگوں میں نئی تردید ہوگی

لبادہ اُوڑھ کر تنقیص کا وہ
جو کہتا ہے مجھے تنقید ہوگی

ہیں فاقہ کش تھکے ہارے مسافر
سکوں کی اب انھیں بھی نیند ہوگی

ہیں بے صبری میں پیمانے پرانے
تری مے سے نئی ہی عید ہو گی

نئی آب و ہوا تشکیل دے کر
محبت کی نہیں اب دید ہوگی

ترے الطاف ایسے ہی رہے پھر
گلی کوچوں میں پھر تشدید ہوگی

OO

سنتورُاس کے لب تھے نفس اک چناب تھا
سانسوں کے سُر میں بولتا کوئی رباب تھا
پڑھتا رہا ہے زندگی میں عشق کے سبق
جس کے لئے یہ چہرہ تمہارا کتاب تھا
چھینے ہیں وقت نے مری تاریخ کے ورق
دھندلا گیا ہے جو کہ ہمارا نصاب تھا
ماتھے کی ہر شکن پہ یہ لکھا گیا ہے اب
وہ خواب جھوٹ تھا وہ فسانہ سراب تھا
الطافؔ مے کدہ میں دیے کی وہ آڑ میں
دیکھا تو شہر کا کوئی عزّت مآب تھا

OO

تمہارے شہر میں بانٹے تھے اپنے خواب نئے
صدائے چنگ پہ گائے تھے اپنے خواب نئے

ہوائیں لے گئی اُن کو اڑا کے صحرا میں
بکھرتی ریت پہ رکھے تھے اپنے خواب نئے

وہ لفظ اُڑ گئے وہ اقتباس ہی نہ رہے
کتابِ عمر میں رکھے تھے اپنے خواب نئے

وہ خواب جن کی تمنا میں گل بریدہ ہوئے
زبانِ تیغ پہ رکھے تھے اپنے خواب نئے

صدائے خلق تھی لیکن اُسے خرید اگیا
اسی کے ساتھ بکے تھے اپنے خواب نئے

لہو نہایا تھا پوشاک وہ کسی ماں کا
تمام عمر کے اس پہ تھے اپنے خواب نئے

لٹے تھے قافلے الطاف جس ڈگر پہ کبھی
ردائے خاک پہ رکھے تھے اپنے خواب نئے

○○

تیرتی کاغذ کی کشتی تھی پرے وہ میں ہی تھا
نہر کے ساحل پہ ٹوٹے تھے گھڑے وہ میں ہی تھا

میں ابھی زندہ ہوں دفنایا جسے وہ اور تھا
جو پسِ دیوار سایہ تھا ترے وہ میں ہی تھا

سُرخ آندھی نے جہاں چھینی تھیں شاخیں پیڑ کی
تپتے صحرا میں جسے دیکھا کھڑے وہ میں ہی تھا

جن پہ نامانوس لفظوں کی عبارت درج تھی
راہ میں دیکھے تھے کاغذ جو پڑے وہ میں ہی تھا

دیکھ آیا ہوں اسے اک بار اپنی آنکھ سے
جس کو جنت سے نکالا تھا ارے وہ میں ہی تھا

تو ہی قادر ہے ترا ارض و سما پر راج ہے
عہد تھا جس پر شفاعت کا ترے وہ میں ہی تھا

تھی مشیت کیا تو ہی جانے یہ تیرا کھیل ہے
کس طرح اس زندگی نے بت گھڑے وہ میں ہی تھا

لکھ رہے ہیں وہ ازل سے تا ابد جو کچھ ہوا
دوش پر جس کے کبھی کاتب گڑے وہ میں ہی تھا

عمر بھر الطافؔ ان کو ڈھونڈتا پھرتا رہا
خواب جس کی جھولی میں اُس نے دھرے وہ میں ہی تھا

OO

خودکو وہ رکھے گا یکتا وہ کبھی ایسا نہ تھا
راہ میں چھوڑے گا تنہا وہ کبھی ایسا نہ تھا

اُس نے پڑھ لی تھی مری مانوس لفظوں کی کتاب
حرفِ جاں کردے گا رسوا وہ کبھی ایسا نہ تھا

قد غنیں ڈالے گا وہ مری پرواز پر ہردم
پر کتر ڈالے گا بے جا وہ کبھی ایسا نہ تھا

اپنی دھن میں نام تیرا لے گیا مجذوب تھا
زہر کا پی لے گا پیالہ وہ کبھی ایسا نہ تھا

ہم نے دی یہ جاں اُسی جانِ جہاں کو اور وہ
دے گیا تاریک کمرا وہ کبھی ایسا نہ تھا

وصل کی رگ پر تو اس نے پھیر دی ہے اک لکیر
ہجر کے موسم بھی لے گا وہ کبھی ایسا نہ تھا

میں صدا دیتا رہا الطاف اُس کے در پہ روز
لہجہ پہچانے نہ میرا وہ کبھی ایسا نہ تھا

OO

یہ کوئل کیسا نغمہ گا رہی ہے
مرے دل کو بہت تڑپا رہی ہے

خلاؤں میں پرندے چیختے ہیں
زمیں پر کوئی آفت آ رہی ہے

نہیں کھلتا کہ ہے اب ماجرا کیا
دریچوں سے صدا کچھ آ رہی ہے

ابھی تک گھر کی چھت رو رہی ہے
مرا سب کچھ بھگوئے جا رہی ہے

کئی صدیوں سے جس کے منتظر تھے
وہ چادر آسمانی چھا رہی ہے

یہ آدھا سچ بھی اب پورا ہوا ہے
ہماری باڑ فصلیں کھا رہی ہے

جو کل تک بے زباں الطاف ٹھہری
وہی نَے اب ترانے گا رہی ہے

OO

عمر بھر جو لکھی کتاب سراب
مرے نغمے ترا شباب سراب

وہ جو اُڑتے تھے دل کے ساگر پر
سارے نکلے ہیں وہ عقاب سراب

وہ جو احساس تھا یا منظر تھا
وہ صبا تتلیاں گلاب سراب

جھوٹ ہے عکسِ یار رنگِ بہار
سب رتوں کا ہے اک حباب سراب

طفلگی یا شباب بجھتا چراغ
عمر بھر پی تھی جو شراب سراب

جب نہ بجھ پائے تشنگی اپنی
میری خاطر ہے یہ چناب سراب

وہ جو الطاف داستانیں تھیں
رخِ لیلیٰ پہ تھے نقاب سراب

OO

آنکھوں سے اُبلتے سبھی گوہر مجھے دینا
بچھڑے ہوئے لمحوں کے مقدر مجھے دینا

جب چھین لے مجھ سے مرا پوشاک زمانہ
تم اپنی وفاؤں کی چادر مجھے دینا

جب بند ہوں ہر سمت یہ مے خانۂ الفت
تم اپنی نگاہوں کے ساغر مجھے دینا

معدوم خلاؤں میں ہو جاؤں جو اک دن
تم ابر بچھائے ہوئے بستر مجھے دینا

جو ساتھ گزارے تھے کڑی دھوپ میں ہم نے
وہ عمر کے لمحے سبھی آ کر مجھے دینا

رکھا ہے کہاں وقت نے تو ڈھونڈ اسے پھر
اے آئینے وہ عمر کا پیکر مجھے دینا

الطاف بچھائی ہے عدو نے فضا میں آگ
بکتر نہیں تو لفظ کے لشکر مجھے دینا

OO

ابھی پانی پہ لکھے لفظ کو کہنا بہت ہے
ابھی اِس آگ کے دریا میں جو بہنا بہت ہے

دریدہ ہو گیا رنگت اُڑی کپڑا ہوں ایسا
مجھے اِس شہر کے عیار نے پہنا بہت ہے

بھریں دوکانیں ہیں اور لوگ ہجرت کر چکے ہیں
فصیلِ شہر کو پل پل یہاں ڈھنا بہت ہے

ہمارے جسم کے کپڑے ہی شاید کام آئیں
ٹھٹھرتی رات کے مُوسم کو اب سہنا بہت ہے

بجھانے کی ہوائیں چاہے جتنا زور کر لیں
دیا ہوں آخری اِس شہر میں رہنا بہت ہے

ڈھلے ہیں دھوپ کے ہمراہ سائے بھی ہمارے
ہماری رات کا اب چاند بھی گہنا بہت ہے

کبھی الطافؔ تم چوگان بھی کھیلو یہاں پر
یہاں اسرارؔ ہیں قدموں میں بھی رہنا بہت ہے

OO

ہم کیسے کہیں نشہ بتدریج بڑا ہے
یہ موت کا سامان یہاں کب سے پڑا ہے
کس کس کے لئے صحبتیں معقول نہیں ہیں
کس کس کے لئے شہر میں یہ وقت کڑا ہے
جو بویا ہے وہ کاٹنا ہو گا مجھے اک دن
آفت میں یہاں کب سے مرا شہر پڑا ہے
امروز بھی غارت ہے یہ فردا بھی ہے غارت
ہے لختِ جگر جس کا وہ مایوس کھڑا ہے
الطافؔ زمانے میں بھلا کس کو پکاریں
پاگل ہے کوئی اور کوئی زنداں میں پڑا ہے

OO

جو نہ لے سکا تھا ترے لئے یہی سوچ کے تو دکھی ہوئی

وہ ترے نصیب کی بالیاں اُسی طاق میں ہیں پڑی ہوئی

وہ اُداس لمحوں کے لفظ سب ہیں کتابِ جاں پہ لکھے ہوئے

وہ عنایتیں ترے درد کی رگِ جاں میں سب ہیں چھپی ہوئی

تجھے دیکھ لوں یہی آس تھی نہ تو دور تھی نہ ہی پاس تھی

وہی مے گزشتہ شباب کی ہے ذرا سی اب بھی بچی ہوئی

وہ بدن بھی تھا کسی اور کا جو سخی نہ مجھ پہ ہوا کبھی
وہ اُداس بو ترے حسن کیا بھی جسم میں ہے بسی ہوئی

کئی مدتوں سے الاؤ ہے کہ سُلگتے آب پہ ناؤ ہے
جو تری جھلک سے جلی یہاں نہ بجھی وہ آگ لگی ہوئی

کبھی قیس گزرا تھا تشنہ لب کبھی رانجھا گزرا ہے جاں بلب
جو بھی گزرا ہے وہ فقیر سا یہ عجوبہ تیری گلی ہوئی

تو اُفق کی گود سے دے جنم کسی آفتاب کو پھر صنم
ہے جبینِ شوق کے درمیاں یہ سیاہی شب کی ملی ہوئی

وہ جو خط نہ تم نے پڑھا کبھی دیا ڈاکیے نے وہ پھیر کر
وہی چٹھی اب بھی ہے میز پر مری زندگی کی لکھی ہوئی

OO

تم چلے ہو تو حسیں جشنِ نظر ہم نے کیا
اور اشکوں کا عجب رقصِ ہنر ہم نے کیا
صرف اک پل کے بدلتے ہی زمانے بدلے
ایسا لگتا ہے کہ صدیوں کا سفر ہم نے کیا
عمر کے کتنے ہی لمحوں کی عمارت ڈھو کر
سوچتے ہیں کہ بس اک لمحہ بسر ہم نے کیا
عمر بھر گھر جسے کہتے رہے اب سوچتے ہیں
اک محل درد کا تھا جس میں گزر ہم نے کیا
اور کیا دے تجھے الطاف بجز فکر و نظر
نذرِ اشعار کا نذرانہ مگر ہم نے کیا

OO

حدِ کوہسار پہ ،آفات کا پہرا ہوں ابھی
شہرِ دیوار ، سرِ شام سنہرا ہوں ابھی

اس سے پہلے کہ بنوں دل کسی فن پارے کا
آ مرے خون کے دریا کہ اکہرا ہوں ابھی

ہیں جو ساکت یہ جزیرے تھا طلاطم اِن میں
آئینے میں جو رہا تھا میں وہ چہرا ہوں ابھی

اک بھیانک سی فضا پھیل رہی ہے ہر سو
اجنبی شہر ہے اور رات کو ٹھہرا ہوں ابھی

میرے اطراف ہوئے جاتے ہیں عکسِ الطاف
جو بھی ہو میں تو کسی شاخ پہ لہرا ہوں ابھی

OO

ہیں مناظر سے بستیاں خالی
لے رہی ہیں یہ ہچکیاں خالی

چھو لیا آئینہ جو پوروں سے
ہاتھ آئی ہیں کرچیاں خالی

ڈھونڈتی ہیں ہنوز یاروں کو
قہوہ خانے کی کرسیاں خالی

چاند کو تو بھی چھونے والا تھا
دیکھ لیں تیری مستیاں خالی

گھر کے آنگن میں رنگ بھرتی ہیں
بیٹیاں ہیں یہ تتلیاں خالی

پھل درختوں سے کوئی لے بھاگا
رہ گئیں صرف پتیاں خالی

کن اَثاثوں پہ جنگ تھی الطافؔ
جاتے ہو تو ہیں مٹھیاں خالی

○○

محبت میں جوانی کا دیا ہے

ہتھیلی پر سلگتی جو حنا ہے

لہو دل کا نچوڑا قطرہ قطرہ

یہ ساری رات کیسا رت جگا ہے

کتابوں کے جلے الفاظ سارے

میری تحریر سے سورج اُگا ہے

گئے موسم کی آنکھیں بند کر لو

یہاں یادوں کا ملبہ چیختا ہے

مرے الطاف تیری تشنگی کو

کسی صحرا میں اِک دریا بہا ہے

OO

لمحوں میں بیتے عشروں کے، خوابوں کا بکھرنا یاد آیا
خود اپنے آپ سے درد بھری باتوں کا کرنا یاد آیا

یخ بستہ خشک ہواؤں نے، پھر زرد لباسِ شجر کیا
پھر پتے ٹوٹے شاخوں سے، پھر تیرا گزرنا یاد آیا

یہ درد کے افسانے اکثر، جب نقش ہوئے لوحِ دل پر
اشکوں کے زورِ طلاطم میں، اک اپنا اُبھرنا یاد آیا

جب سروقدوں کے دلدادے، افلاک سے باتیں کرنے لگے
سرسبز چناروں کا سایا، روحوں میں اُترنا یاد آیا

جب رات کی کالی پرچھائیں، ساری دنیا پر چھائی تھی
اک چاند کا چپکے سے میرے، آنگن میں اُترنا یاد آیا

الطافؔ، صدا لا حاصل ہے، وہ لُوٹ کے آنے والے نہیں
بچپن کے کھیل تماشوں کا، مٹّی میں دھرنا یاد آیا

OO

کہاں بچھڑے تھے وہ دن اور مہینے کیا ضروری ہیں
پرُونے دردِ فا الفت کے نگینے کیا ضروری ہیں

اُتر جائیں گے چپکے چپکے آنکھوں کے سمندر میں
شناور ہیں رہیں گے ہم، سفینے کیا ضروری ہیں

تمہارے ہجر کی دولت سے بڑھ کر اور کیا ہوگا
ہیں جب اشکوں کی سوغاتیں، دفینے کیا ضروری ہیں

تمہاری یاد کی پت جھڑ اشارہ کرتی ہے اکثر
گریباں چاک جو ہیں اب وہ سینے کیا ضروری ہیں

مواقع اور بھی ہوں گے یہاں خود کو ڈبونے کے
چھلکتی آنکھوں کے یہ آب گینے کیا ضروری ہیں

تمہاری بات جب الطاف سن لی اُس نے محفل میں
تمہارے اب وہ جانے سب قرینے کیا ضروری ہے

OO

بہتے پانی میں نہ پھینکو یہ وفا روئے گی
ہوگی تحریر جو کاغذ سے جدا روئے گی

جس طرف دیکھو ہیں مٹی پہ یہ شعلے رقصاں
آج لگتا ہے کہ ساون کی گھٹا روئے گی

دور تک برف پہ قدموں کے نشاں پاؤ گے
لب پہ خاموش سے لفظوں کی صدا روئے گی

رینگتے جائیں گے جب اشک ترے کاغذ پر
اس تری یاد میں لفظوں کی ردا روئے گی

آبلہ پائی پہ جب جائے گی الطافؔ نظر
جو الگ رکھی ہے وہ تیری انا روئے گی

OO

پتھر زمانے بھر کے یہاں سہہ رہا ہوں میں
اک سچ ہی ہے کہ جس کو ابھی کہہ رہا ہوں میں

یہ شوخیاں گریں گی سمندر میں ایک دن
دریا کی تیز لہر پہ جو بہہ رہا ہوں میں

اونچی عمارتوں سے تو نسبت نہیں مجھے
مٹی کے آشیانوں کا اک ڈھہ رہا ہوں میں

آنگن میں چہچہاتی وہ چڑیاں نہیں ہیں اب
یہ کون سا مکاں ہے جہاں رہ رہا ہوں میں

دیوارِ عمر دیکھی تو معلوم یہ پڑا
جیسے کہ رفتہ رفتہ بہت ڈھ رہا ہوں میں

الطاف گونجتی ہیں گزشتہ صدائیں پھر
سائے میں آئینوں کے کہیں رہ رہا ہوں میں

○○

گئے موسم کی یادوں میں یہ بیداری کی راتیں ہیں
وفا کیا، دوستی کیا، پیار سب کہنے کی باتیں ہیں
سراسر خواب ہو جائیں گے دنیا بھول جائے گی
یہاں عمریں نہیں کٹتیں، یہاں پر چند راتیں ہیں
میں گزرا تھا جہاں سے بھی وہاں ہر سمت پہرے تھے
تمہارے شہر کے ہر موڑ پر یادوں کی گھاتیں ہیں
کہاں کس رنگ میں، کیسی وہ صبح ہوگی اے سورج
تیری فرقت کی اُلجھی سوت کو چرخے پہ کاتیں ہیں
کوئی اس رن میں کب الطافؔ ہم سے جیت سکتا ہے
جو ہم نے جان کر کھائی ہیں وہ خاموش ماتیں ہیں

OO

دنیا کو مرے سامنے کب پاؤ گے تنہا
جب یار بچھڑ جائیں گے تب آؤ گے تنہا

رونق تو سدا رہتی ہے ان قہوہ گھروں کی
جب ساتھ نہ ہوگا تو پلٹ جاؤ گے تنہا

پوروں سے ٹپک جائیں گی یہ خون کی بوندیں
ہر کانچ کے ٹکڑے کو جو سہلاؤ گے تنہا

ہر روز اگر آنکھ لڑاؤ گے کسی سے
ہر روز کوئی تیر نیا کھاؤ گے تنہا

یہ ٹھاٹھ کسی کام نہ آئے گا ذرا بھی
منہ پھیر کے دنیا سے چلے جاؤ گے تنہا

الطافؔ سنے گا کوئی کب تک یہ کہانی
فرمان کہاں تک بھلا فرماؤ گے تنہا

OO

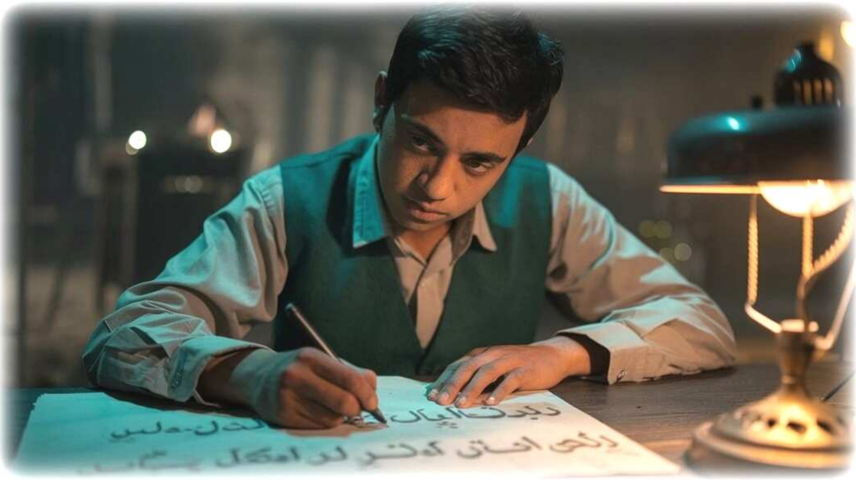

اپنے ماتھے پہ نئے لفظ لکھاتا کیسے
گردشِ دہر ترا جام اٹھاتا کیسے

تو کہ پنہاں رہا ہر پھول میں خوشبو کی طرح
میں ترے پاس اگر آتا تو آتا کیسے

اپنے ہی جسم میں ضم تجھ کو کیا ہے ورنہ
بوالہوسوں سے تجھے اور چھڑاتا کیسے

دہر نے ڈال دیے تالے زبان پر مری
تو ہی بتلا تجھے احوال سناتا کیسے

تو کہ الطاف رہا آئینہ خانوں میں نہاں
تجھ کو ہر وقت ترا چہرا دکھاتا کیسے

○○

دھڑکتے دل کی نازک دھڑکنوں میں دبدباتی ہے
ہمارے آنسوؤں میں تری صورت جھلملاتی ہے

وہ گل اب کیوں ہے پژمردہ جسے سینچا تھا خوں دے کر
بھرے گلشن میں بُلبُل کی صدا اب روز آتی ہے

تصور میں بسا رہتا ہے تو اُس سانس کے جیا
ترے پیروں کی پائل تو ہمیشہ چھن چھناتی ہے

وہ شب کو چاندنی، دن بھر وہ خوشبو کی طرح ہر دم
بہت نزدیک ہو کر بھی، بہت ہی یاد آتی ہے

تھکے ہارے پرندوں کو ہوا الطاف اب ہر دم
پری زادوں کی اک اک داستاں اُن کو سُناتی ہے

○○

ازل سے جس کے لئے ہر نظر طواف میں ہے
وہ بت ہنوز مرے دل کے اِک شگاف میں ہے

ہے راکھ راکھ مرا دامنِ محبت اب
یہ سگرٹوں کا دھواں کس لئے طواف میں ہے

شفق شفق ہیں مکیں اور مکاں گلی کوچے
امیرِ شہر تو مدت سے اعتکاف میں ہے

تمام عمر جلائی ہیں بے سبب پوریں
یہ سگرٹوں کی تپش کس کے انکشاف میں ہے

چھوا تھا جس کو تصور نے ایک بار کبھی
وہ ایک خواب ابھی تک اُسی لحاف میں ہے

چنار قد تو ہے الطاف وہ مگر پھر بھی
یہ ایک بات ابھی تک بھی اختلاف میں ہے

OO

جہاں سویا ہوا ہے اور میں ہوں
مرا ہی نقشِ پا ہے اور میں ہوں

ہے جس کا سایہ اب سارے گھروں پر
خلا میں اِک دعا ہے اور میں ہوں

برس بیتے ہیں اُس کچے گھڑے کو
ندی میں تیرتا ہے اور میں ہوں

چناروں سے اُگی چنگاریوں کو
بجھاتی اِک ہوا ہے اور میں ہوں

ہوا کا ہم سفر بننا جو چاہا
ہوا ہی اب ہوا ہے اور میں ہوں

ہوئی ہے صبح بس ہے آخری پل
دیا ٹھنڈا پڑا ہے اور میں ہوں

وہ سورج جس کو چوما تھا نظر نے
سمندر کھا گیا ہے اور میں ہوں

جو شعلوں میں گھلی الطاف کل شب
وہی رنگِ حنا ہے اور میں ہوں

○○

آپ کے یا مرے مدار میں ہے
یہ ہوس کس کے انتظار میں ہے

کس نے چھیڑا ہے ان کے گیسوؤں کو
برہمی سی مزاجِ یار میں ہے

جس میں پڑتے نہیں ہیں اُن کے قدم
مِرا مسکن ایک اس دیار میں ہے

جستجو جس کی عمر بھر کی ہے
وہ کسی اور کے حصار میں ہے

برف پگھلے تو کھِل اُٹھیں موسم
بیج بویا ہوا مزار میں ہے

باغ میں کھل بھی اُٹھا آخری پھول
تو ابھی دشتِ خار زار میں ہے

جس نے ذہنوں کو ہے جلا بخشی
وہ تپش آتشِ چنار میں ہے

کام حالانکہ سارے ختم ہوئے
زندگی اب بھی انتشار میں ہے

شعلہ الطافؔ جھلملاتا ہے
صبحِ نو کے یہ انتظار میں ہے

○○

دلوں میں سُوز بھر کر آنکھ میں اختر بناتا ہوں
کہیں کچھ ہو میں اپنے خون سے گوہر بناتا ہوں

غنیمِ وقت کے حملے سے لوگوں کو بچانا ہے
میں آہنگر ہوں ان کے واسطے بکتر بناتا ہوں

شہیدوں کے جو خوں میں ڈوبے ہیں کنکر وہ چنتا ہوں
جنہیں کل مائیں پہنیں گی میں وہ زیور بناتا ہوں

وہ مُردے نوچتے ہیں اپنے کتبے پھاڑ کر قبریں
میں اُن کو پھر سُلانے کے لئے چادر بناتا ہوں

نئے رنگوں سے کاغذ پر اُنھیں تخلیق کرتا ہوں
نہیں جو بولتے ہیں ایسے میں پیکر بناتا ہوں

ہیں جتنے شہر میں پتھر وہ آئیں کام لوگوں کے
میں اپنے واسطے شیشے کا بس اِک گھر بناتا ہوں

اِس اپنے شہر کے فکر و نظر کے کارخانوں میں
ملے موقع تو پھر الطاف میں شاعر بناتا ہوں

○○

جو مہکتے تھے کبھی تازہ گلابوں کی طرح
چل دیے ہیں کسی صحرا میں وہ خوابوں کی طرح

وہ جو اِک شخص سوالوں کی تہوں میں تھا چھپا
شہر در شہر بھکرا ہے جوابوں کی طرح

آتشِ درد نمایاں ہے ہر اک گھر سے یہاں
ہم نے ہر رات گزاری ہے عذابوں کی طرح

تارِ احساس سے اک غم کی صدا اُٹھتی ہے
زندگی ہم نے گزاری ہے ربابوں کی طرح

مدعی تھے کہ بجھائیں گے زمیں کی یہ پیاس
ہم اُڑے اُونچا مگر سوکھے سحابوں کی طرح

برف کے فرش پہ لکھے تھے جو دل کے قصّے
دھوپ نکلی تو وہ پگھلے ہیں حبابوں کی طرح

جو لئے پھرتے تھے جذبوں کے سمندر دل میں
وہی الطافؔ ملے ہم کو سرابوں کی طرح

○○

جیسی ماحول نے کردی ہیں یہ شل سوچیں
ایسے حالات میں کیسے کوئی ہم حل سوچیں

گرد آ کے ہوئی آنکھوں میں اب خیمہ زن
میچ کر اپنی نگاہیں میں کوئی حل سوچیں

سارے صفحات نئی بارشوں میں بھیگ گئے
کیا تھا تاریخ کے صفحوں پہ یہ اک پل سوچیں

ہم حواسوں کو کریں اپنے تعلق آمیز
دھوپ ہو تیز اگر دن میں تو بادل سوچیں

ذہن کو چاٹتا پھرتا ہے محبت کا فریب
آج ہونا ہو جو الطافؔ وہ ہم کل سوچیں

OO

کس سے کس کا رشتہ ٹوٹا، اندر باہر سب خاموش
زونؔ کا نغمہ، میرؔ کی جھانجر، نوحہ گھر گھر سب خاموش

جب تک باغ تھے میرے سلامت، شور مچاتے تھے جھرنے
اب تو آگ لگی پھولوں میں دریا ساگر سب خاموش

شعلوں کی بارش ہے ہر سو، سُرخ زمیں کا چہرہ ہے
عادل بھی خاموش کھڑا ہے پیار کے دفتر سب خاموش

کل تک مے خانے میں رہتی، استقبال میں ہر شے تھی
اب ساقی بے روح پڑا ہے، شیشے ساغر سب خاموش

اُس کا چہرہ صبحِ بنارس اُس کی زلفیں شامِ اودھ
لاکھوں لفظ تعریف میں اُس کی، لب پر آکر سب خاموش

کل کیا شاخِ زیتوں لے کر فاختائیں پھر آئیں گی
آج تڑپتی ہر سو زخمی، بکھری در در سب خاموش

آج اگر الطاف ہیں اُس کے جسم پہ موسم کی رونق
کل تو برف سے لپٹی ہوں گی، آنکھیں، پیکر سب خاموش

OO

نوٹ: زونؔ سے مراد کشمیری زبان کی شاعرہ حبہ خاتون اور میرؔ کشمیری زبان کا رومان پرور شاعر رسل میر ہے۔

گلاب سرووصنوبر حسیں دہن والے
لہو میں ڈوب گئے آج سب چمن والے

ہم اپنے صحن میں بارش اُتارے بیٹھے ہیں
قریب آئیں گے سارے دھنک بدن والے

جہیز پہ جھگڑتے رہے مگر تب تک
پھسل گئے وہ سبھی پل جو تھے لگن والے

کڑی ہے دھوپ چناروں کے جل گئے پتے
پگھل ہی جائیں گے اب موم کے بدن والے

نجات عہدِ محبت سے کب میسر تھی
کہ پارہ پارہ تھے جتنے تھے پیرہن والے

بڑھائی ہم نے ہی توقیر تیری عظمت کی
وگرنہ تیرے لئے اور بھی تھے دھن والے

بدل ہی دیں گے چناروں کے نام بھی الطافؔ
نظر اُٹھائے کھڑے ہیں یہ کالے پھن والے

○○

دہر میں اپنے ہر اک غم کا مداوا رکھنا
حبس گر ہو تو کھلا دل کا دریچہ رکھنا

رات کی رانی بکھیرے گی بہت جب خوشیوں
اپنے آنگن میں کسی سانپ کا کھٹکا رکھنا

نیند میں لوگ بہت چلنے لگے ہیں شاید
وصل کے خواب میں اب اور شناسا رکھنا

تا کہ لوٹ آئے کوئی جاتا ہوا یار الطافؔ
پیار کے جھرنوں کی آواز میں نغمہ رکھنا

○○

اکثر دل کی بات میں آکر، دیکھو کیسا کام کیا ہے
رسوائی کا بوجھ اُٹھا کر جو بھی کیا ہے سب روا ہے

دروازے سر پھوڑ رہے ہیں، کمرے میں ہے آہ و بکا
کیسی ہیں بے وقت ہوائیں، گھر کو چھوڑ کے کون گیا ہے

میرے دروازے پہ کل شب، پھر سے اُس کا سایہ اُبھرا
بھیس بدل کر جس ناگن نے میری نسوں میں زہر بھرا ہے

سارے کاغذ میز پہ بکھرے، ہچکی پہ ہچکی آتی ہے
تنہائی کے اس جنگل میں، شاید اُس نے یاد کیا ہے

جس بستی کی پھلواڑی میں پیار سے ناگن نے کاٹا تھا
پھر الطافؔ اُسی نگری میں، تیرا ڈیرا آن پڑا ہے

ابھی سے آپ کیوں غم کر رہے ہیں
ابھی کچھ لوگ مرہم کر رہے ہیں

محبت کی یہاں وہ شمع لے کر
سحر کو رات میں ضم کر رہے ہیں

گلوں پہ خون کے یہ سارے منظر
ہماری آنکھ پُرنم کر رہے ہیں

رویہ پیار کا تھا جن کا وہ اب
ہماری فکر کچھ کم کر رہے ہیں

وہ اک مجبور ماں کے گرتے آنسو
دلوں پہ وار پیہم کر رہے ہیں

یہ ہر اک آستاں پر لوگ سارے
جبینیں اپنی کیوں خم کر رہے ہیں

وہ ماضی کے سہانے خواب ہر شب
مرا الطافؔ ماتم کر رہے ہیں

OO

شہرِ گل پوش کی، گلیاں کیوں اُجڑی ہیں
کس نے لوٹا اسے، چوڑیاں بکھری ہیں

کس کے گھر جائیں گے کربلا کے یزید
یہ انائیں سبھی سروں پر ٹھہری ہیں

اُس جبیں پر سجی بندیا سورج کی ہے
عشق کے دفتروں میں صبحیں نکھری ہیں

دے گئی ہے ردا بے کفن پیڑوں کو
برف کی پریاں جو گاؤں میں اُتری ہیں

کس لئے نازاں ہے چاند آکاش پر
وہ ثریا ، وہ انجم سبھی میری ہیں

اب کے بادل پھٹا خون برسا یہاں
پتھروں پر لکھی تاریخیں میری ہیں

رنگِ قیصر سے لکھ تو بھی الطافؔ اب
نوکیں غنچوں کی اب سینوں میں اُتری ہیں

○○

تمہارے شہر میں مت پوچھو کیا کیا چھوڑ آئے ہیں
مکیں جس میں رہے برسوں، وہ حجرہ چھوڑ آئے ہیں

جہاں لکھنے تھے ہم نے پیار کے الفاظ مستی میں
وہ کاغذ سارے کا سارا ہی کورا چھوڑ آئے ہیں

ہماری یاد دلوائے گا ہر لمحہ جو لوگوں کو
تمہارے شہر میں ہم اپنا سایہ چھوڑ آئے ہیں

مجھے الزام دیکھو تم نہ دینا رُت بدلنے کا
جسے ہم خود نہ سمجھے وہ فسانہ چھوڑ آئے ہیں

جہاں جھرنوں کے سُر پر لفظ کا پیکر بنایا تھا
وہیں الطافؔ ہم شہکار نغمہ چھوڑ آئے ہیں

OO

فضا میں پھیل گئے ہر طرف سے راگ سفید
اڑا دئے ہیں عجب منصفوں نے کاگ سفید

ابھی تھے بیضوؤں میں فاختاؤں کے بچے
چُرا کے انڈے سبھی لے گئے ہیں ناگ سفید

اُداس سارے سخن داں، ادیب، اہلِ نظر
جلایا جس میں قلم ان کی تھی وہ آگ سفید

یہ کیسے لوگ ہیں مرتے ہیں اک عجوبہ کیئے
اُبلتا خون ہے سڑکوں پہ اور جھاگ سفید

ہمارے آنگنوں میں اب کے برف بھی ہے سیاہ
کہاں گئیں وہ رُتیں، جب یہاں تھا ماگ سفید

لہو میں ڈوبتے الطاف، سارے یہ اخبار
حروف نوچ رہے تھے گلی میں کاگ سفید

OO

کیسے قسطوں میں لہو دے کے سجا دوں تجھ کو
اب زمیں مانگے نمو، کیسے بھلا دوں تجھ کو

گونج ہے تیرے بدن کی مرے لفظوں سے عیاں
اپنے شعروں میں تِری آہ سُنا دوں تجھ کو

اِس سے پہلے کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں
اک حسیں یاد کی نگری میں بسا دوں تجھ کو

اوس کی بوند سے پھولوں کی سحر گاہی تک
دیکھتا جو ہوں میں وہ سب ہی دکھا دوں تجھ کو

تو میرے خواب کی صد رنگ پری ہے جاناں
نئے انداز میں اب ایک صدا دوں تجھ کو

راکھ ہو کر بھی یہ الطافؔ جلا سکتا ہے
میں یہ لفظوں کا حسیں کھیل دکھا دوں تجھ کو

○○

چشم و دل ہے منتظر اُس آنکھ کی تقطیر کا
آخری اک چھرگی جو بن سکے تنویر کا

میں ابھی تک منتظر ہوں ایسے منصف کا یہاں
فیصلہ لکھے جو میرے شہر کی تقدیر کا

آتشیں سیال سا روشن رہے گا نسلوں تک
وہ نشانہ ہے مرے بھائی تمہارے تیر کا

کیا جہنم کی تھی آتش جس میں ہم بھنتے رہے
نام جس کو دے دیا سب نے یہاں تقدیر کا

اب اُفق کے دوش پر منظر عجب الطاف ہے
گونجتا ہے ایک ہی نعرہ جہاں تکبیر کا

OO

وہ دفعتاً ہی کل شب ہم سے کہیں ملے تھے
یادوں کے آئینوں میں خوابوں کے معرکے تھے

صحرا کے گرم منظر دیکھے گئے نہ اُن سے
وہ موم کے بدن تھے ہمراہ جو چلے تھے

اب بھی ہرے ہیں پتے اُس یاد کے شجر پر
گو پھل کبھی نہ آیا پر پھول تو کھلے تھے

اک دن چھوا تھا تو نے اُن کھنڈروں میں مجھ کو
جن گنبدوں میں گونجے الفت کے قہقہے تھے

پھر چاک کر کے چھوڑا اُن کو گلوں کی ضد نے
کانٹوں کی نوک سے جو زخمِ جگر سلے تھے

گھر کے منڈیر پر جو بیٹھا ہوا ہے پنچھی
اس کے سنہرے پر تو بیتے برس جلے تھے

پت جھڑ کی رُت تھی لیکن الطافؔ کو جو دیکھا
سارے بدن پہ اُس کے زخموں کے گل کھلے تھے

OO

اُگ آئیں وہ شکلیں ایسا ہوتا ہے
اشکوں کی یہ فصل یونہی تُو بوتا ہے

ہنس ہنس کر جو زخم پرائے سیتا تھا
پچھلی شب سے آج بہت وہ روتا ہے

پیاسا پیاسا گھر برسوں سے پیاسا ہے
یوں تو ساون شہر کو خوب بھگوتا ہے

کس کو پرکھیں یار وفا کی بھٹی میں
یار تو یار ہیں یاروں کا کیا کھوتا ہے

گر برسات ہوئی تو فصلیں جھومیں گی
ہم نے بھی یادوں کا بنجر جوتا ہے

وہ الطافؔ کوئی دیوانہ ہی ہوگا
لفظوں کی گٹھڑی کو جو بھی ڈھوتا ہے

OO

اپنے آپ کا جب بھی ہمیں ادراک ہوا
کیسا کرشمہ دیکھو تہِ افلاک ہوا

سونے اور چاندی میں جو تُلتا ہی رہا
آخر وہ بھی اس دنیا میں خاک ہوا

میری متاعِ عشق پہ کتنا نازاں ہے
مجھ کو لوٹنے والا کیا سفاک ہوا

ارضِ بدن سے میں ہی گزرا ہنس ہنس کر
میرا جسم ہی اب میری پوشاک ہوا

جس بازار پہ نازاں تھے الطافؔ بہت
اک لمحے میں وہ سارا خاشاک ہوا

○○

کیسے لوگ تھے زخم پرائے دھوتے تھے
اگلے وقتوں میں یارانے ہوتے تھے

جذبوں کی چق ماق میں بھیگے سب لمحے
پہروں لفظوں میں ہم آگ پروتے تھے

اشکوں کی یہ فصلیں تب بھی اُگتی تھیں
لیکن اُن کے بیج انوکھے ہوتے تھے

اک ایسا بھی وقت آیا تھا الفت میں
پہروں ہنستے تھے ہم پہروں روتے تھے

دِل کی بستی میں الطافؔ یہ حالت تھی
شوق کے جھرنے غم کے اُبلتے سوتے تھے

OO

یہ لوحِ وقت نہ پڑھتا تو اور کیا کرتا
ورق ورق نہ بکھرتا تو اور کیا کرتا

حقارتوں سے جسے دیکھتا تھا سارا شہر
میں اُس سے عشق نہ کرتا تو اور کیا کرتا

وہ شاخِ گل کی طرح مرے ساتھ رہی
میں زخم زخم نہ ہوتا تو اور کیا کرتا

برس رہی تھی ہر اک سمت آتشیں بارش
نہ زلفی سائے میں سوتا تو اور کیا کرتا

وہ قرض مانگتا تھا آج میری پشتوں کا
میں جان نذر نہ کرتا تو اور کیا کرتا

عجیب شخص تھا خود آگ پی گیا ساری
نہ شہر بھر کو بچاتا تو اور کیا کرتا

وہ جس کے ہونے سے یہ صبحِ نو نہ ہو پاتی
وہ شمع گر نہ بجھاتا تو اور کیا کرتا

کُریدتا رہا الطاف خاکِ دل میرا
شرر نہ اِس میں جگاتا تو اور کیا کرتا

○○

حدِ جنوں کو بھلا کہاں تک ایسے پھیلائیں گے لوگ
یوں تو پیار لٹانے والے آئیں گے جائیں گے لوگ

جب تک جسم میں خون کی شدت ہے یہ بھٹی سُلگے گی
ورنہ اپنے آپ سے شاید کترا کر جائیں گے لوگ

یہ یخ بستہ بھلا لکیریں روک سکیں گے کیا رستہ
خون کی گردش میں آتش کو جب لیکر آئیں گے لوگ

لمحے کے گرداب میں اب تک اپنی کشتی رقصاں ہے
اُس پل کیا منظر ہوگا جب ساحل چھو پائیں گے لوگ

کتنے موسم دھڑکن بن کر دل میں شور مچاتے ہیں
کب وہ رت آئے گی مل کر نغمے جب گائیں گے لوگ

نام و نمود کی جب الطاف یہ خواہش بے جا ابھرے گی
اپنے اپنے نام کے کتبے قبروں سے لائیں لوگ

○○

اُلجھن تھی دل کی دل میں ہوا کو پتہ نہ تھا
اس درد کے دھویں میں کوئی راستہ نہ تھا

خود ہم کاٹ ڈالے ہیں ہاتھ اُس کے سامنے
وہ لکھ دیا ہے جو سرِ محفل کہا نہ تھا

کیوں جشن غازیوں کا منائیں ہم ان دنوں
آنگن میں بت ہنوز ہیں کوئی گرا نہ تھا

صحرا میں ہر قدم پہ رہا سر پہ آفتاب
اور دشت میں بھی سایہ کہیں پر رکا نہ تھا

الطافؔ یہ زمین کا سورج تو ڈھل گیا
پر روشنی کو شہر میں کوئی دِیا نہ تھا

OO

کیا زمیں اپنی کیا زماں اپنا
دے رہا ہے یہ دل بیاں اپنا

اب اندھیروں کے سرد نشتر ہیں
شمع اُن کی تھی اور دھواں اپنا

آؤ مل بیٹھیں کوئی بات کریں
یہ جو لمحہ ہے پھر کہاں اپنا

کتنی صدیاں گزار کر نکلا
ایک ہی پل میں بس جہاں اپنا

سارے عالم پہ جب ہے سبز طناب
کیوں سلگتا ہے سائباں اپنا

ہم بتائیں بھی کیا اب اے الطافؔ
عشق میں ہو گیا زیاں اپنا

OO

صنم خانوں کی پھر سے اب نئی تعمیر دیکھو
قلم کاغذ پہ رقصاں ہے معۂ زنجیر دیکھو

جہاں جو چیز تھی دیکھو وہاں اب وہ نہیں ہے
نگر کی تم بدلتی روز و شب تصویر دیکھو

یہاں تانی ہے چادر دیر سے چلۂ کلاں نے
بہت مدت سے یخ بستہ نیا کشمیر دیکھو

شبِ تاریک میں اُترا ہے سورج آسماں سے
اگر ہے دیکھنا اس خواب کی تعبیر دیکھو

تمہارے سامنے جو کچھ ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے
پسِ دیوار انگاروں کی اک تحریر دیکھو

پلٹ کر جو کبھی الطاف پھر آتے نہیں ہیں
دریچے سے زرا جھانکو وہی رہگیر دیکھو

OO

ترے جانے سے بے کلی سی ہے
ایسا لگتا ہے کچھ کمی سی ہے

ترے بن کٹ رہی ہے عمر کی شام
جیسے بیوہ کی زندگی سی ہے

کون رہتا ہے دل کے شیشے میں
ایک بے شکل آدمی سی ہے

جو محبت ہے دل کی دھڑکن ہے
مرے پہلو میں اجنبی سی ہے

کبھی نفرت کبھی محبت ہے
عشق ہے یہ یا عاشقی سی ہے

بند ہر سمت ہیں در و روزن
ایک کھڑکی ہے روشنی سی ہے

چھید ڈالا ہے وقت نے اس کو
وہ بھی الطافؔ بانسری سی ہے

OO

جہاں بیٹھے تھے ہم سو بار اکثر
وہ چوراہے بنے بازار اکثر

اندھیرے میں جگر کی لو جلا کر
بہت ڈھونڈے پرانے یار اکثر

گلوں پر آئینے شبنم کے ٹھہرے
ترا ان میں ہوا دیدار اکثر

لیے جاتی ہے وہ تحت الثریٰ میں
بھنور میں گھومتی رفتار اکثر

بچھڑتے جو کبھی اک پل نہیں تھے
وہ اب بدلے ہیں میرے یار اکثر

یہاں الطاف نوکِ آرزو سے
سلے ہیں پیرہن کے تار اکثر

OO

وہ پنچھی بے نوا ہے کیا ہوا ہے

گلوں میں جو پلا ہے کیا ہوا ہے

بھیانک سے اندھیرے گنبدوں میں

کوئی تو چیختا ہے کیا ہوا ہے

جسے گم نام سفاکوں نے لوٹا

وہ اب کیوں بولتا ہے کیا ہوا ہے

بہت بیتے رتوں کی عشرتوں پر
مجھے کیسی سزا ہے کیا ہوا ہے

کھڑے ہو پیالۂ سقراط لے کر
طبیبو! کیا دوا ہے کیا ہوا ہے

جو جانِ روح تھا اس بزم کا پھر
وہ محفل سے اٹھا ہے کیا ہوا ہے

کہیں الطاف وہ پھر لوٹ آئیں
اُنھیں پوچھیں پتا ہے کیا ہوا ہے

○○

یہ رعونت تو فقط عشروں کی مہماں ہوگی
اس کا حاصل یہ زمیں خون سے ارزاں ہوگی

نیم کے پتّے ہواؤں میں اُڑے جاتے ہیں
کیا کہیں وقت کی یہ زلف پریشاں ہوگی

ہم نہ ہوں گے نہ چمن ہوگا مگر دنیا میں
ہر طرف یاد کی اک شمع فروزاں ہوگی

سر جو زر کے لئے تاریخ کا لے جاتے ہیں
کیا وہ اِک سوچ کبھی زود پشیماں ہوگی

سچ ہے الطاف بجُز طٰہٰ لقبؐ کوئی نہیں
بس وہی ایک نظر اپنی نگہباں ہوگی

OO

غم اگر سینے میں ضم ہو تو غزل ہوتی ہے
یا کوئی تازہ الم ہو تو غزل ہوتی ہے

رات سُنسان ہو، بوجھل ہوں سبھی کی سانسیں
روح رنگوں میں بھسم ہو تو غزل ہوتی ہے

وحشتِ رفتہ ہی دے ٹوٹ کے دستک دل پر
جاں بلب رنگ رقم ہو تو غزل ہوتی ہے

دشت میں، خواب میں، رنگوں میں سفر میں ان پر
اُن کی جو چشمِ کرم ہو تو غزل ہوتی ہے

رنگ بکھرے سے لگا کرتے ہیں کہساروں پر
عارضِ وقت بہم ہو تو غزل ہوتی ہے

مجھ سے کہہ جاتی ہے کچھ بادِ صبا اے الطاف
کیا کوئی خاص ستم ہو تو غزل ہوتی ہے

OO

ہر اک دھڑکن اسے دی تھی مگر آہستہ آہستہ

یہ دنیا پھر بھی ہم نے جی مگر آہستہ آہستہ

وہ کالی زلف تھی تیری کہ شب کی تیرگی اے دوست

مرے چہرے پہ وہ بکھری مگر آہستہ آہستہ

کبھی پھل دار پیڑوں کے بہت دلکش مناظر تھے

شجر سے شاخ جھکتی تھی مگر آہستہ آہستہ

منافق تھیں ہوائیں غاصبانہ رُت تھی جوبن پر

اُسی موسم کی تلخی پی مگر آہستہ آہستہ

جسے الطافؔ چھیدوں سے بھرا دورِ حوادث نے

ہے ڈھوئی ہم نے وہ گٹھڑی مگر آہستہ آہستہ

OO

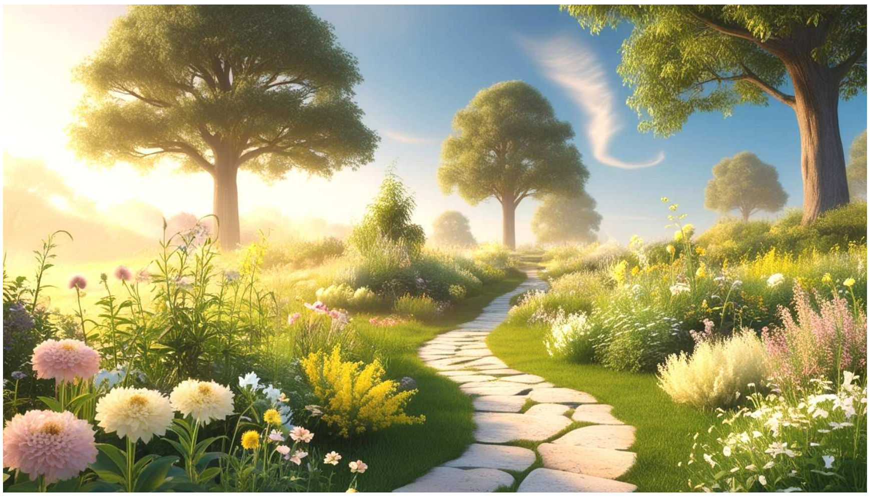

وہ رنگوں آئینوں اور عکس کی شہکار تھی گویا
شفق کو اپنے لب سے چومتی دیوار تھی گویا

یہی ہونا تھا آخر دشتِ غم میں اُس مجسم کو
ہمارے ہجر میں وہ بھی بہت بیمار تھی گویا

کبھی وہ گل کبھی شبنم کبھی آنسو کبھی آنکھیں
فضاؤں میں وہ نادیدہ سی پُر اسرار تھی گویا

کبھی تھی بجتی زرد پتوں کے بکھرنے کی صدا کوئی
کبھی چاندی میں لپٹی وہ کوئی زردار تھی گویا

دھرا ہے ہم نے آپ اپنا محبت کی کسوٹی پر
یہاں پورا اُترنے کا وہی معیار تھی گویا

ہمیں الطاف اس کے لمس سے بس زخم ہی آئے
گلابوں سے سجی وہ شاخ بھی پُر خار تھی گویا

OO

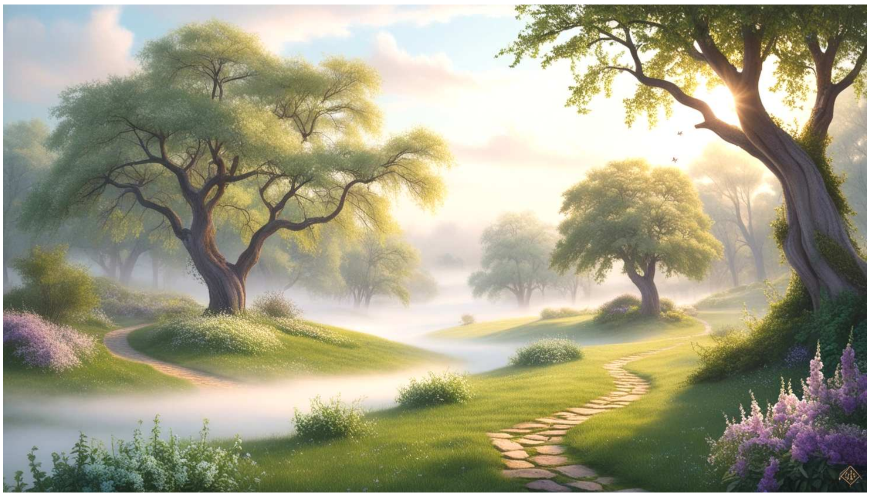

ایک خوشبو کی طرح روز لُبھایا ہے تجھے
چاہنا جیسے تھا بس ویسے ہی چاہا ہے تجھے

زندگی میں جو کبھی پایا ہے تنہا خود کو
اپنی آنکھوں میں کئی بار اُتارا ہے تجھے

تو کہ خوشبو ہے کہ سورج کی کوئی پہلی کرن
ایسا ہی ہم نے کسی لفظ میں سوچا ہے تجھے

تجھ کو آواز میں ڈھونڈا ہے مغنی بن کر
اک نئے سُر میں نئے راگ میں گایا ہے تجھے

لوگ کہتے رہے بت تجھے دیوار تجھے
اِن عذابوں سے بہت ہم نے بچایا ہے تجھے

گیت غزلیں کبھی افسانے سُنائے پھر بھی
ہم نے لفظوں کے شکم میں بھی چھپایا ہے تجھے

ہم نے رکھا ہے تجھے آنکھوں میں موتی کی طرح
ہم نے الطاف ترے ہجر میں پہنا ہے تجھے

OO

آسیب چھا گئے ہیں سبھی جال کی طرح
ذہنوں کو کاٹتے ہیں کسی پھال کی طرح

حُلیے گزشتہ شب کے، وہ انساں تو نہیں تھے
رقصاں تھے آنگنوں میں جو دھمال کی طرح

آتش ہی برستی رہی غنچوں پہ گلوں کے یہ
سال قیامت ڈھا گئے سال کی طرح

کل تک جو شہرِ یار تھے گلیوں میں آج وہ
ہاتھوں میں کاسہ لے کے ہیں کنگال کی طرح

یہ سال، گئے سال، کئی بیتی رتوں کے
گزرے ہیں سبھی آتشِ سیال کی طرح

○○

کام باقی ہے ابھی اور بکھر جانا ہے
چند گھڑیوں کے گزر جانے سے گھر جانا ہے

ہے ازل سے ہی یہاں لکھی ہوئی ہجرت اپنی
اک نگر سے ہمیں اب اور نگر جانا ہے

سازشیں ابر میں رقصاں ہیں خبر ہے ہم کو
سرخ بارش سے مگر پھر بھی گزر جانا ہے

تو ہی بتلا نہ رہے تجھ پہ جو مرنے والے
کس کی خاطر تجھے اب پھر سے سنور جانا ہے

ہے حقیقت کہ بہے گا یونہی دریا پھر بھی
اس کو اک روز سمندر میں اتر جانا ہے

میرا محبوب ہی کرتا ہے یہ تعینِ الطاف
کتنے دن اور یہاں ہم کو ٹھہر جانا ہے

OO

عکس تھی آئینوں میں رہتی تھی
ایسی صورت کبھی نہ دیکھی تھی

اُس کا لہجہ تھا سخت گرم مگر
چُھو لیا تو وہ برف جیسی تھی

وہ جو کھڑکی پہ شور کرتی تھی
آج چڑیا وہ ہم سے روٹھی تھی

کوئی منظر نہ اب کوئی پیکر
بس یہی بات ہم نے سوچی تھی

جھریوں میں اُداس لمحوں کی سمٹی
صدیاں بھی ساتھ لائی تھی

پا بجولاں تھے ہم بھی گلیوں میں
اُس کی خواہش بھی تن پہ پہنی تھی

بارشیں کھیل ہے نصیبوں کا
میری چھت تو سدا سے سوکھی تھی

رت بدلتی تھی جس کے ہنسنے سے
ایسی پگلی بھی ایک ہوتی تھی

قہقہوں کے جھمیلے میں الطافؔ
چپکے چپکے بہت وہ روتی تھی

OO

مدت کے بعد خود سے ملا مسکرا دیے
بالوں میں لپیٹے ہی حنا مسکرا دیے

تاریخ عبرتوں کی رقم ہے سرِ فلک
بت وقت کے بنے ہیں خدا مسکرا دیے

کچھ لوگ دوستوں کے لبادے میں آگ کو
دامن سے دے رہے ہیں ہوا مسکرا دیے

پھر اس نگر کی یاد کا جھونکا کہیں اٹھا
سانسوں سے آ رہی ہے صدا مسکرا دیئے

یہ طے ہوا زمیں پہ شفق چھائے گی بہت
کیا ہوگی اب خدا کی رضا مسکرا دیئے

اُس کے لرزتے اشک نے چپکے سے یوں کہا
یہ کیسی الفتوں کی سزا مسکرا دیئے

اس شوخ کی ادا تھی کہ الطافؔ راہ میں
کانٹوں کا اہتمام کیا مسکرا دیئے

○○

بولتا ہے وہ گجر وقت گزر جائے گا
آب دے کر ہیں تبر وقت گزر جائے گا

سرنگوں ہوتے گئے قیصرو کسریٰ کے مکیں
اب ہے شمشیر دگر وقت گزر جائے گا

نہ سگِ کوچہ تو بن نانِ شبینہ کے لئے
وقت سے پہلے نہ مر وقت گزر جائے گا

تو نے کانٹوں سے گلابوں میں قدم رکھا ہے
تو نکھر اور سنور وقت گزر جائے گا

تھے ترے زیرِ قدم جاہ و حشم تاج سبھی
رت نے بدلی ہے ڈگر وقت بدل جائے گا

نام بدلے ہیں تو کتبے بھی بدل جائیں گے
گاؤں ہو یا کہ نگر وقت گزر جائے گا

پھر سے اُبھرے گا سرِ شام وہ مہتاب کبھی
ظلمتِ شب سے نہ ڈر وقت گزر جائے گا

ہم نے اے آگ بھلا کب نہ بجھایا ہے تجھے
آ ہی جائے گا عمر وقت گزر جائے گا

تیری فرقت میں لہو وحشت و دمن میں بھرا
آبلوں کا ہے سفر وقت گزر جائے گا

مدتیں ہو گئی بچھڑے ہوئے الطافؔ اسے
اشک پی یاد نہ کر وقت گزر جائے گا

OO

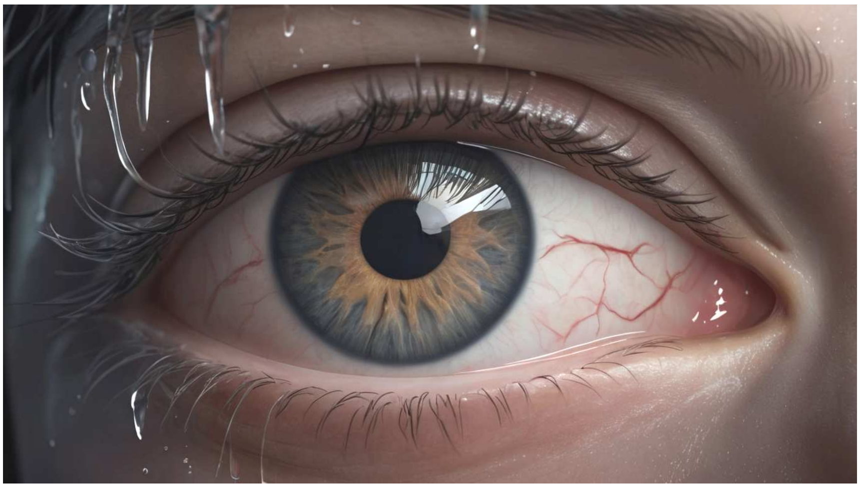

بھیگتی آنکھ کی کھڑکی سے عیاں ہوتا ہے
ترے بچپن کا محل آج بہت روتا ہے
ترا معمار کڑی دھوپ میں دن بھر سلگا
رات بھی تیرے تصور میں کہاں سوتا ہے
عمر بھر ہم نے جو بوئی تھیں تری یادوں کی
چاندنی رات میں وہ فصلیں کوئی ڈھوتا ہے
کہتے ہیں ایک ملنگ بیٹھ کے چوراہے پر
اپنے اشکوں سے کسی شے کو بہت دھوتا ہے
نیند آتی ہے اسے ہجر میں دنیا بھر کی
بڑے آرام سے الطافؔ ترا سوتا ہے

به یادِ فدا آ کشتواڑ

سوئے عدم چلے ہمیں کر کے وہ غم زدہ
احباب و دوستوں کو گئے چھوڑ کر فداؔ

لفظوں کے ہر طرح سے بناتے رہے محل
تحریر بے مثال تھی اشعار تھے جدا

آئینے پر رفیق پسِ آئینہ دگر
کرتے رہے وہ دوستوں کی در گزر خطا

شفقت تھی چھوٹوں پر تو بڑوں سے محبتیں
یاروں کے یار تھے وہ ہمیشہ کے خوش نوا

محشر میں ان کو اللہ کرے سرخ رو بہت
یہ دل سے مغفرت کی ہے اُن کے لئے دعا

ہے یہ پرورد گار سے دست بستہ اب دعا
پسماندگاں پہ ڈال دے بس صبر کی ردا

یادوں میں جھلملا تا ہے الطاف وہ ابھی
کب تک پڑے گی سہنی ہمیں اور یہ سزا

OO

اس کے جسم پہ لاکھوں چہرے ہر اک چہرا شفق شفق
غنچوں کے وہ رنگ میں شامل پرچم ٹھہرا شفق شفق
یار میرے بچپن کی راہیں اور شباب کی پھلجھڑیاں
قریہ اور وہ گلیاں ساری، ہر سو پہرا شفق شفق
دور کہیں سراب کی صورت وہ تھے یا کچھ اور ہی تھا
دامن سے لپٹی یادوں کا رنگ سنہرا شفق شفق
خوب بساط بچھا رکھی ہے اس ظالم نے ہر گھر پر
کھیل یہ سارا شطرنجی ہے مہرا مہرا شفق شفق
سارے صحیفے وہیں پہ اُترے، درسِ اخوت بھی الطاف
دیکھ فلسطیں کے نوشوں کا سہرا سہرا شفق شفق

○○

خوشہ خوشہ چن کر لائے، ساری رات کٹائی سے
کب کب دانہ کون چگے گا پوچھے کون خدائی سے

پار افق سے آ کر اُس نے کیسے خواب دکھائے ہیں
سپنوں کا سوداگر تھا وہ کیا پوچھیں ہرجائی سے

ایک نئے انداز سے کل پھر سورج جیسا نکلوں گا
رات ابھی ہارا ہی نہیں ہوں میں اپنی تنہائی سے

دیوانے کی ضد کو پا کر وہ محمل سے جھانکتے ہیں
ہم نے بھی ملبوس لیا ہے آج کسی سودائی سے

وہ جو مرتد بن بیٹھا ہے، وہ تو چہرے سے بھی گیا
سکے چند سمیٹ لئے ہیں اُس نے آج گدائی سے

ذہن ہوا مقبوض تو لب پر تالے ہیں الطاف یہاں
کیا چاہیں کیا بولیں ہم تو دور ہوئے ہیں رسائی سے

OO

سرنگوں خود نہ ہوئے اور نہ پس پائی لی
ہم نے زخموں سے قلم کے لئے رُشنائی لی

بانجھ لفظوں کی جو دھن پر تھا یہاں محو رقص
اُس نے پہلو میں فقط ایک ہی ہرجائی لی

اُس نے وہ تیر چلائے جو کہ اب تھے ہی نہیں ہم ہم نے
اس رن میں عدو سے نئ بینائی لی

اپنے ایمان کا اب خود ہی جنازہ پڑھ کے
ہم نے مغرب سے بہت خوب پذیرائی لی

گلشنِ دہر میں اب چھوڑ کے آسانی کو
تم نے الطاف یہ کیا آبلہ پائی لی

OO

نویدِ صبح کے زخموں کا مارا
اُفق نے ننھے ہاتھوں سے پکارا

اُگا آنگن میں سورج تھا جو دیکھا
وہ روٹی کا عمودی تھا کنارا

سمندر کی ہے تہہ میں آگ رقصاں
زمیں پھر ہو گئی ہے بے سہارا

لہو سورج کا ہر جانب رواں ہے
فلک کرتا ہے کب سے یہ اشارا

زمیں کی کوکھ میں ہے شور کیسا
کوئی تو چیختا ہے وہ ہمارا

اسی ظلمت کی ان دیکھی طرف سے
کوئی خورشید اُبھرے گا دوبارا

ابابیلوں کے کنکر چاہیں اب
بہت مشکل میں ہے کعبہ ہمارا

قلم کی نوک پر الطاف لرزاں
وہ اشکِ ناتواں تھا یا ستارا

OO

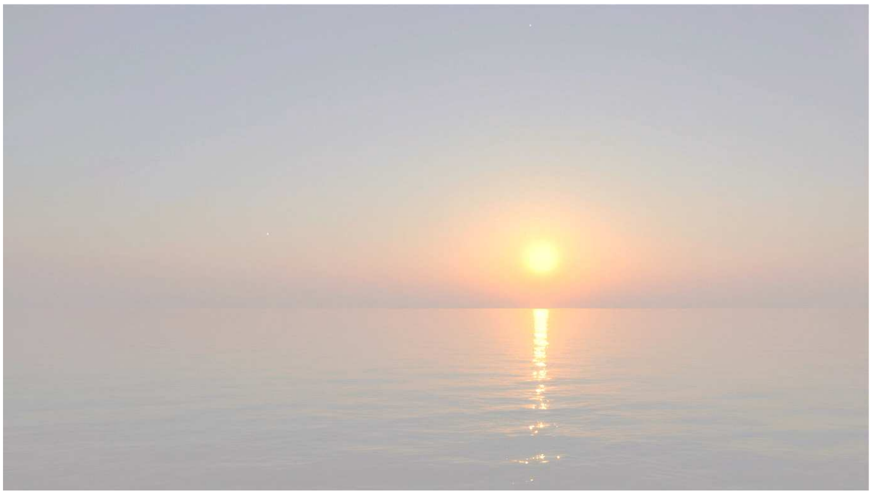

یہاں ہر سمت رنگوں کے نظارے ٹوٹ جاتے ہیں
فلک کی کہکشاں دیکھو ستارے ٹوٹ جاتے ہیں

گئے موسم کی ساری سلوٹیں بستر پہ آتی ہیں
بدن پر برف چھاتے ہی سہارے ٹوٹ جاتے ہیں

کوئی آواز دیتا ہے پسِ دیوار سے شاید
مقفل گوش ہوں جب تو اشارے ٹوٹ جاتے ہیں

کہیں پت جھڑ کا موسم تھا کہیں سلگا ہوا صحرا
سو اب یادوں سے دریا کے کنارے ٹوٹ جاتے ہیں

کہیں الطافؔ ہیں عمروں کے شیشے اور کہیں ساغر
مگر اب شام سے پہلے یہ سارے ٹوٹ جاتے ہیں

○○

کوئی آنسو بہا بارش کی خاطر
چراغِ دل جلا بارش کی خاطر

دعائیں بارشوں کی کر رہے ہو
کیا ہے کیا بتا بارش کی خاطر

گلی کوچوں میں دیگیں سج گئی ہیں
یہ لوگوں کو کھلا بارش کی خاطر

سبھی ذی روحوں کا والی ہے جو وہ
کرے گا فیصلہ بارش کی خاطر

عمل ہیں لائقِ بارانِ پتھر
ہے پھر بھی یہ صدا بارش کی خاطر

کسی مے کش نے زاہد سے یہ پوچھا
کُھلے گا مے کدہ بارش کی خاطر

صدف کو جو گہر الطاف دے دے
کرو میں وہ دعا بارش کی خاطر

○○

وہی بادل وہی گیسو یہاں پھر چھا کے جاتے
گئے موسم کبھی تو آنگنوں میں آ کے جاتے

قلم قرطاس بکھرے روشنائی ڈھونڈتا ہوں
چلے آتے ہمارے خواب سب لوٹا کے جاتے

مرے کمرے میں مدت سے پڑی اس لاش کو تم
بچا کے سب کی نظروں سے کبھی دفنا کے جاتے

پُرانی فائلیں ساری کتابیں چھانٹتا ہوں
مرا کھویا لڑکپن تم کہیں سے لا کے جاتے

جو گونجے گا سرِ مقتل نرالی شان سے اب
نئے لفظوں کا وہ تازہ سا نغمہ گا کے جاتے

جو راتوں کو یہاں بوئے گئے الطافؔ آنسو
وہ فصلیں اپنے دامن میں کبھی سمٹا کے جاتے

○○

وہ اک خواہش تھی، لیکن وہ مری حسرت نہیں تھی
جو رنگوں آئینوں میں ڈھل چکی صورت نہیں تھی

بہت کی کوششیں ، سو بار اس کو گدگدایا
وہ مورت تھی کسی پتھر کی کچھ حرکت نہیں تھی

چرائی آئینے سے شکل جس نے رفتہ رفتہ
شکایت تھی بھلے اس سے مگر نفرت نہیں تھی

اَٹا ہوا گرد سے بے طرح اس کا سارا چہرہ
چھپا بس نام تھا اُس میں کوئی شہرت نہیں تھی

سلگتے ریگزاروں میں رگڑتی ایڑیاں جو
وہ ماں کی کشمکش تھی صرف وہ عورت نہیں تھی

ہوا کے ساتھ یادوں کا کوئی جھونکا چلا تھا
وہ ہرجائی تھی پروائی، کوئی عشرت نہیں تھی

عجب اک سانحہ تھا یہ میاں الطافؔ کل شب
دیے گل ہو گئے تھے صبح کی ندرت نہیں تھی

OO

اُس نے دی تھی صدا، جانبِ دلرُبا ، ہم کو جانا پڑا
وہ جو اپنا لگا ، تھا دھواں یا ہوا ، ہم کو جانا پڑا

سارے کھیل اور تماشے اسی کے تو ہیں، کھیلا یگ یگ سے جو
اُس کے ہاتھوں میں ہے، دے سزا یا جزا، ہم کو جانا پڑا

دشتِ تنہا میں دروازے کی کُنڈیاں ، رہ گئی ہیں کہاں
کوئی آیا یہاں ، بسترِ جاں اُٹھا ، ہم کو جانا پڑا

ساحلوں پہ وہ تنہا سا بیٹھا ہوا، شب کا منزل نما
ڈھونڈتا ہے نشاں ، راہ روئے بے نوا ہم کو جانا پڑا

یاروں کی منڈلیاں ، وہ گلی ڈنڈیاں ، شوخیاں مستیاں
شہر یہ تھا ترا، سونپ کر اقربا ہم کو جانا پڑا

چھید تھے وقت کے، جس میں الطاف ہے یہ، کپڑے کیسے لئے
زیبِ تن کرے جوڑا بہت یاد کا ہم کو جانا پڑا

OO

وقت کے ساز پر، گیت برہا کا اب، گُنگنا نا پڑا
اپنے ہاتھوں سے ہی، اپنا ڈولا یہاں اب اٹھانا پڑا

تنکا تنکا یہ خوابوں کا تھا آشیاں، جو سجایا یہاں
یہ تھا چھوٹا نگر، چھوڑ کر بام و در، مسکرانا پڑا

جن میں آباد تھے آرزو کے محل، مری پیاری غزل
اپنی آنکھیں، کسی طاق پر چھوڑ کر، روٹھ جانا پڑا

میں کسی اور کے گم خیالوں میں تھا، یا سوالوں میں تھا
تم کو مرے لئے ساری دنیا سے چھپ کر اب آنا پڑا

لفظ اشکوں کے دریا سے چنتا رہا ،اور گاتا رہا
تھا وہ سوزِ نہاں، مرے پیچھے یہاں، اک زمانہ پڑا

تھا چراغوں میں روغن ابھی کچھ بچا، شوق کا جوش کا
دور اک قبر کا، تھا بجھا سا دیا جو جلانا پڑا

سنگ ریزے زمیں سے میں چنتا رہا، اُس کو سُنتا رہا
زون تھی نغمہ زن، تھا اُسی کا لحن، مجھ کو آنا پڑا

لفظ تیرے تھے یا ہیں کسی اور کے یا نئے دور کے
وہ جو الطاف تھا، اُس کو سوزِ صدا، آزمانا پڑا

○○

درد سے خود دوائیں نکلیں گی
جسم سے جب قبائیں نکلیں گی

روشنی مٹھیوں میں قید کرو
اُنگلیوں سے شعائیں نکلیں گی

بے رخی سے جو پیش آؤ کبھی
ماں کے لب سے دعائیں نکلیں گی

تم محبت کے دل سے بات کرو
پتھروں سے صدائیں نکلیں گی

برہنہ سر صدائے دختر سے
بادلوں سے ردائیں نکلیں گی

جب زمیں پر زمیں کے لعل لڑیں
بین کرتی وہ مائیں نکلیں گی

ہم بھی الطاف اُن کو دیکھیں گے
شہر سے جب وفائیں نکلیں گی

OO

فلک پر چاند سا تھا میں نہیں تھا
کسی کا آئینہ تھا میں نہیں تھا

مرے صحرا میں پھیلا دور تک جو
کسی کا نقشِ پا تھا میں نہیں تھا

جہاں تھا کھیل تاروں کا قمر سے
نگر کا در کھلا تھا میں نہیں تھا

گلی کوچوں میں فن خیرات کرتا
کوئی شاعر نما تھا میں نہیں تھا

مرے آئینے میں تھی شکل جس کی
وہ کوئی آشنا تھا میں نہیں تھا

جسے تھا بند پایا مدتوں سے
وہ در تو اب کھلا تھا میں نہیں تھا

جسے ڈھایا تھا صدیوں بعد مل کر
وہ اک خانہ خدا تھا میں نہیں تھا

بہایا تھا اُسی نے آب جاتے
مجھے وہ دیکھتا تھا میں نہیں تھا

سلگتے وقت کی بھٹی میں پل پل
کوئی جانِ وفا تھا میں نہیں تھا

ہوئے الطاف جب معدوم موسم
مرا سایہ جدا تھا میں نہیں تھا

OO

وادیٔ عشق میں بدلے ترے رُتبے کتنے
قیس بن کر تری لیلیٰ کو ہیں لُٹتے کتنے

جب وہ مرحوم ہوا پھر نہ ملے وہ مجھ کو
میں نے لکھے تھے ترے نام کے کتبے کتنے

وہ جو سویا ہے تجھے دیکھنے کی حسرت میں
تو نے ڈالے ہیں وہاں خاک کے مشتے کتنے

دن ڈھلا شام کے سائے بھی ہوئے ہیں گہرے
ہم ترے در پہ بھلا اور بھی رکتے کتنے

اپنے حصے کے سبھی کھا لئے دانے ہم نے
زندگی بکھرے ہوئے اور یہ چگتے کتنے

مرحلہ اور قفس کا ہے بہت ہی سنگیں
عمر کے دن یہ بتا جیل میں بھگتے کتنے

کل ہی بازار میں وہ مانگ رہا تھا جیون
آج الطافؔ اسے دیتے ہیں کاندھے کتنے

○○

شبِ فرقت میں ہم نے خوب رویا کون سویا
فلک سے ٹوٹتے تاروں کو کھویا کون سویا

جو طاقوں میں پڑا تھا دل کا کاسہ غم شناسا
وہ زنگ آلود برتن میں نے دھویا کون سویا

تری پلکوں پہ چمکا اک ستارا تھا ہمارا
محبت کا کسی نے بیج بویا کون سویا

وہی تاریخ پتھر پر لکھی ہے جو بنی ہے
قلم کی نوک کو خوں میں بھگویا کون سویا

فصیلِ شہر میں کل رات جو تھا آخری سنگ
وہ پتھر آگ کا ہم نے ہی ڈھویا کون سویا

کوئی الطافؔ پیکر تھا کسی کا کون تھا وہ
کسی کی یاد کا پرتو تھا گویا کون سویا

OO

چاند کی سسکیاں، چاندنی میں یہاں، چھوڑ کر بستیاں اُس کو جانا پڑا
کاٹ کر صدیاں، وقت کی ندیاں، درد کی تلخیاں، اُس کو جانا پڑا
وہ تھا دِل کا محل، عشق تھا جس کا گھر، ٹوٹے دیوار و در
درد تھا جوش میں میری آغوش میں سہہ کے بے تابیاں اُس کو جانا پڑا
حسن کے گاؤں سے، زلف کی چھاؤں سے، جھولتی بانہوں سے
آنکھ دریا نما، لب پہ آہ و بکا، چھوڑ کر سب یہاں، اُس کو جانا پڑا
اون کی کرتیاں، گھاس کی جوتیاں، پانیوں سے بھریں، وہ لیے مٹکیاں
آئیں پروائیاں، پھر رچی مہندیاں، رو کے ہمجولیاں، اُس کو جانا پڑا
صوفیوں کا نگر، الفتوں کا سفر، روشنی کا دیا تیری دہلیز پر
تھے وہ الطاف سبھی مشعلوں کے میں، لے کے شمعِ اماں، اس کو جانا پڑا

○○

اُسے اب توڑ دو یا ساز بدلو
چلو تم بھی کوئی پرواز بدلو
اُگلتی ہے زمیں اب آگ ہر سو
فضا میں بارشوں کے راز بدلو
سنہرے سانپ اژدر بن گئے ہیں
سپیرو تم نئے انداز بدلو
وہ پیشانی بدلنے پر بہ ضد ہیں
سنو تم بھی نگاہِ ناز بدلو
اگر الطافؔ وہ ہیں معجزاتی
تو پھر تم بھی یہاں اعجاز بدلو

OO

گلوں سے تتلیوں، تاروں سے چھانی اک کہانی
سُنائے تو تلے لفظوں میں رانی اک کہانی

وہ آنگن اور وہ مٹی کے برتن، بھیگا تن تن
تڑپتی یاد میں اُن کی نشانی اک کہانی

بھرا میلا تھا آیا لے کے پھر وہ خالی تھیلا
جو گھر پہنچائی تھی جاں فشانی اک کہانی

میں نغمہ لکھ نہ پایا اور مغنی ساز پر ہے
نہیں آتی ہے لفظوں میں روانی اک کہانی

گزر جائے گا یہ طوفان سارا ہے اشارا
دکھاتی ہے یہ پانی کی روانی اک کہانی

یہ بے آواز بنجر سا یہاں ہر آدمی ہے
یہ پیاسا ہے نگر نایاب پانی اک کہانی

بچھڑ کر مجھ سے اس نے رات کاٹی پتھروں پر
وہ غم! الطافؔ تھا، یا پیش مانی اک کہانی

OO

پہنچے دیس پرائے پنچھی شام گئے
لوٹ کے پھر نا آئے پنچھی شام گئے

چور تھکن سے، دور سفر سے آئے تھے
دانوں پر گھر آئے پنچھی شام گئے

کنڈی تھی دروازے پر گھر خالی تھا
آنگن پر منڈلائے پنچھی شام گئے

اُن کے بھی سنگی بچھڑے تھے طوفاں میں
رو رو کر سب گائے پنچھی شام گئے

شہر کی دلدل میں جب ڈوبے سارے لوگ
رہ رہ کر شرمائے پنچھی شام گئے

اک ہی پل میں ساری دنیا بدل گئی
تھے میرے ہمائے پنچھی شام گئے

کہہ دو تم الطاف فضاؤں سے اب کے
آئے پھر نا جائے پنچھی شام گئے

OO

جو ساغر ٹوٹ کر گھر میں سجائے روٹھ جائیں گے
سمندر کھاتے ہی سورج، یہ سائے روٹھ جائیں گے

طنابیں کھینچ لو بادل گھنیرے آسماں پر ہیں
ستم خوردہ سبھی اطفال آئے روٹھ جائیں گے

چراغِ زندگی سے کی منور پیار کی دولت
دیے وہ صبحِ دم شب کے جلائے روٹھ جائیں گے

سجائے تھے قفس میں تو نے جو بیمار سے پنچھی
وہ کچھ لمحے جو پل بھر کو ہنسائے روٹھ جائیں گے

تجھے جب خوف آئے گا یہاں الطاف موسم کا
ہیں جتنے پیرہن تن پر سجائے روٹھ جائیں گے

○○

جب سائے لمبے ہوتے گئے، میں جاگ پڑا احساس ہوا
سورج تھا نزع کے عالم میں، سانسوں کا تب سنیاس ہوا

اِس بات میں بھی گہرائی تھی، وہ حسن تیرا سچائی تھی
اِس فاقہ کشی کے عالم میں، وہ عشق تھا جو، اجناس ہوا

وہ خواب میں بھی اک خواب رہا، دن میں جیسے مہتاب رہا
بیدار ہوا، تھی غم کی کسک، جو راس نہ تھا اور راس ہوا

تھیں سردرتیں اور تیز ہوا، تھے برف میں لپٹے شجر و مکاں
پھر جھیل کی یخ بستہ   ستہ پر، کونجوں کا اک اجلاس ہوا

وہ ہجر نے غم کی لاج رکھی، جو وصل میں بھی نہ بات بنی
پھر تیری یاد کے بوسوں میں، یہ پتھر بھی الماس ہوا

تھی دریا کی سی الھڑتا، بھتا آنکھوں میں آنسو لرزاں
پھر وقت کی اندھی گردش میں، وہ قطرہ بھی بے آس ہوا

اسلاف کی دھرتی پر دیکھو، انصاف کا کیسا گھیرا ہے
الطاف نگر کے لوگوں پر، پھر خواب کسی کا خاص ہوا

OO

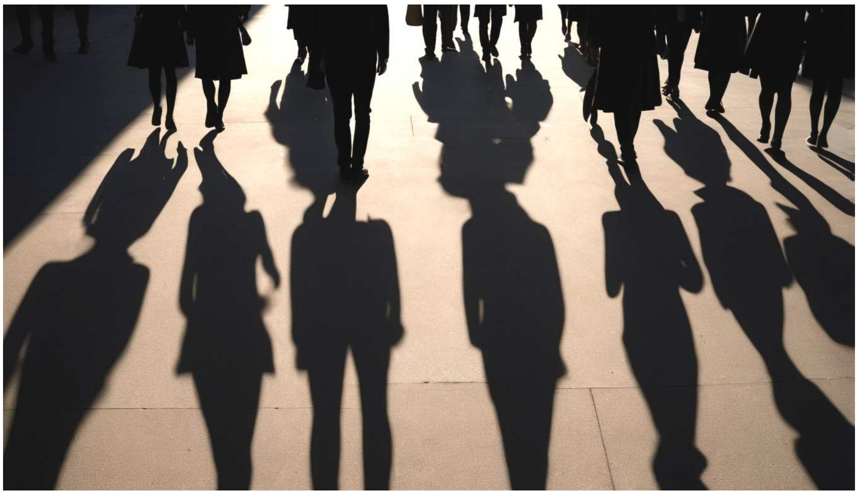

کرن کرن جس سے پھوٹتی تھی، وہ شبنمی سا گلاب چہرا
ورق ورق لفظ شاعری کے، لکھا تھا کس نے کتاب چہرا
کواڑ بھی وا تھے مے کدے کے، سیاہ بادل میں بجلیاں تھیں
ہیں شیشے ساغر ادائیں اُس کی، وہ بارشوں کا شراب چہرا
وہ دشت کے پھول جا بجا تھے، ہیں خوشبوؤں کے اداس ڈیرے
وہ سرمئی شام کا تھا کاجل، شفق شفق تھا شباب چہرا
جو آپ ہی اپنا سنتری ہے، وہ تیر و نشتر دیے ہیں رب نے
نگاہ پلکیں جھکی ہیں خود ہی، ہے حسن کا وہ نقاب چہرا
تھے صاف شیشے یہاں بھی اپنے، کرم تھے ان کے کسی کی خاطر
ہماری جانب نہ اک نظر کی، تھا اس قدر کیا خراب چہرا

OO

ہو سکے تو وہی حالات مجھے لوٹا دو
میرے کھوئے ہوئے دن رات مجھے لوٹا دو

درد میں ڈوبے سوالات بہت مشکل تھے
میرے اشکوں کے جوابات مجھے لوٹا دو

روزنِ چشم پہ لرزاں تھے جو موتی کی طرح
ہے گزارش وہ خیالات مجھے لوٹا دو

عنبریں زلف میں گجرے کی وہ پر کیف مہک
اب کی برسات میں وہ رات مجھے لوٹا دو

زعفراں میں کبھی شعروں میں ٹٹولا برسوں
زونؔ اور میرؔ کے نغمات مجھے لوٹا دو

تم کواڑوں سے، دراڑوں سے کیا کرتے تھے
وہ محبت کے اشارات مجھے لوٹا دو

مجھے لینا ہے جہاں سے نہیں کچھ بھی الطافؔ
میری گلیاں، مری سوغات مجھے لوٹا دو

OO

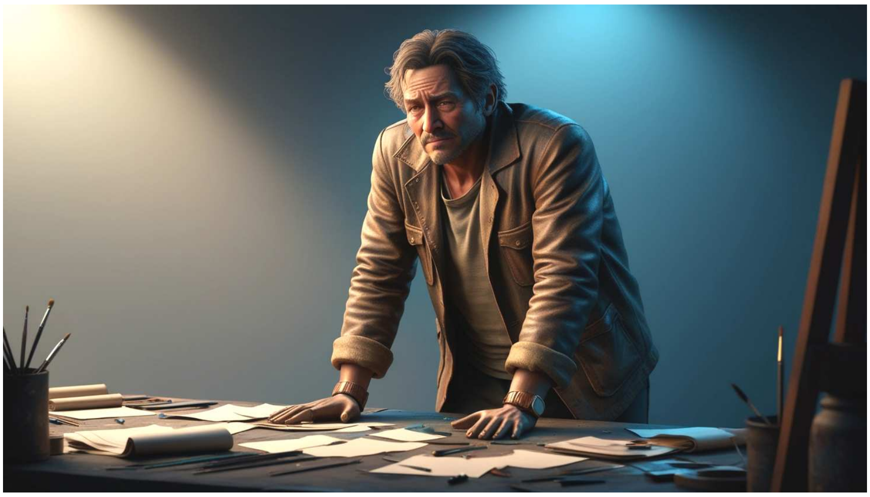

شبِ معراج کی یہ رات عجب ہے واللہ
نور میں ڈوبی ہوئی رات عجب ہے واللہ

وہی اُمت ہے کوئی سویا کوئی سجدے میں
جس کی خاطر تھی یہ سوغات عجب ہے واللہ

کٹ مرے ہیں کہیں معصوم کہیں سودا گری
اب کے ہیں بس یہی حالات عجب ہے واللہ

ارض دنیا پہ جو افضل تھی کبھی اعلیٰ تھی
اب ہے وہ غرقِ خرافات عجب ہے واللہ

ہیں کہیں پاک، کہیں عرب و ایران کہیں
برسرِ موجِ فسادات عجب ہے واللہ

لوٹ کر مفلس و نادار کی محنت کا صلہ
ہیں دعاؤں کو اُٹھے ہاتھ عجب ہے واللہ

لبِ لعلیں ہے تو غازہ ہے سجا گالوں پر
پڑھ رہی ہے وہ کوئی نعت عجب ہے واللہ

آمدِ عشقِ نبیؐ کا یہ عجب عالم ہے
کہیں غم ہیں کہیں نغمات عجب ہے واللہ

OO

آئینوں میں کسی صورت کو اُتاریں کیسے
زلف اُلجھی ہو تو پھر اُس کو سنواریں کیسے

وہ صراحی پہ ہو یا کہ بکھرتی شے پر
اُن کے ہاتھوں کا چھپا لمس نہاریں کیسے

جھیل میں لہر کی شمشیر رواں ہے ہردم
زلفِ شب گوں کو نکھاریں تو نکھاریں کیسے

جو ترے ہجر میں چاٹے ہیں سبھی دیمک نے
اُن کتابوں سے وہی لفظ اُبھاریں کیسے

غرق صحرا وہ ہواؤں نے کئے تھے کب کے
لب سلے لوگ کسی کو بھی پکاریں کیسے

اس کا انصاف تھا الطاف کفن میں لپٹا
یہ جنازہ تری گلیوں سے گزاریں کیسے

OO

بڑے عذابوں سے اب ہم نے جس کو پالا ہے
وہ اک غنیم مرے گھر میں آنے والا ہے

کواڑ سارے مقفل ہیں کھڑکیاں بے نور
مکان چھوڑ دیا اُس نے یا نکالا ہے

جہاں بسیرا تھا کچھ پنچھیوں کا برسوں سے
وہ پیڑ وقت کی دیمک نے چاٹ ڈالا ہے

قریب و دُور نظر میں نہیں کوئی منظر
مرے حبیب تیری یاد کا یہ ہالا ہے

وہ زہر پھونک رہے ہیں ہمارے چہروں پر
ہیں آستیں کے مکیں جن کو ہم نے پالا ہے

گلے میں سانپ لیے واعظوں کی آمد ہے
خدا کے گھر میں سجایا ہوا شوالہ ہے

وہ بھیک میں مجھے الطاف دے گیا امرت
پیوں میں کیسے یہ سقراط کا پیالا ہے

OO

ہُوا ہے ابر تلے چاند، غم کی ساعتوں میں
یہ سارے اشک پیے، سی کے زخم راتوں میں

عطائے رب ہے کہاں، فرقوں کا ہے یہ قائل
تم عشق بانٹ رہے ہو یہاں بھی ذاتوں میں

بقال اپنا بھی ہے، اُن کی چاہتوں کا اسیر
حساب جس کا لکھا ہے ہمارے کھاتوں میں

بدل بدل کے چلیں راہیں شہرِ الفت میں
ہمارے دوست ہیں لازم ہماری گھاتوں میں

کرشمہ سازیاں کتنی ہی ہم نے دیکھی ہیں
وہ چاند توڑ کے لائے ہیں باتوں باتوں میں

بہار آئے گی مرجھائے گل کھلیں گے کہاں
کہ خار اور خزاں ہے ہمارے ناتوں میں

بچھڑتی رُت کا میں افسوس کر رہا الطافؔ
وہ ہاتھ دے گیا تب تک کسی کے ہاتھوں میں

OO

ہمارے ساتھ عجب واقعہ کیا اس نے
زمرد ہم سے لیا، توتیا دیا اس نے

بہ صد خلوص تجھے طشتری میں دل دے کر
محبتوں سے لیا توڑ کر دیا اس نے

ردائے جاں جو الجھتی رہی تھی خاروں سے
کہ پارہ پارہ ہوا پیرہن سیا اس نے

نفاق کی ہمیں تفسیر خود ہی سمجھا کر
منافقوں کو صفوں میں بٹھا لیا اس نے

گماں کی طرح کہیں یا یقیں کی صورت میں
تخیلات کو اپنے میں بس جیا اس نے

فضا میں آگ تھی الطاف اور زمیں پہ لہو
ہزار موسموں کا زہر بھی پیا اس نے

○○

تمام عمر جہاں گھومے وہ تو میلا تھا
ہماری جیب میں تو ایک بھی نہ ٹھیلا تھا

وہ شخص جا بھی چکا تھا رتیں بھی بدلی تھیں
مگر وہ پھول سرِ شاخ دل اکیلا تھا

میرے جہاں کو شعورِ مسافرت دے کر
بجھا گیا جو دیا وہ ہوا کا ریلا تھا

قلم میں تھا، کبھی میزوں پہ، کاغذوں میں کہیں
تمام کمرے میں وہ شخص کیسے پھیلا تھا

کسی نے دی ہے صدا اب کے دور آنگن سے
وہ ایسا یار کہ جس سے کبھی نہ کھیلا تھا

چھڑایا ساتھ، مرا ہاتھ چاند راتوں میں
محبتوں کا سبق وہ تو پہلا پہلا تھا

غلاف تھا کوئی الطاف اُس کی یادوں کا
جو بعد مدتوں اب بھی نیا نویلا تھا

OO

وہ نیلی نیلی آنکھیں تھیں، جو جھیل بھاند توڑ کر
تھا تشنہ لب مرا نگر، وہ آئی گاؤں چھوڑ کر
دعائیں اس نے کی وہاں، برف گری ابھی یہاں
گری نگاہ سے کُرچیاں، دلوں کے شیشے توڑ کر
یہ کون ہے یہ میں نہ تھا، یہ برف، جھریاں یہاں
وہ شکل ٹکڑے ٹکڑے ہے، یہ آئینے بھی جوڑ کر
یہ دوستوں کی چاہ میں، ہر اک نگر کی راہ میں
میں پہنچا آ کے کس ڈگر، یہ راہیں اپنی موڑ کر
ہیں لفظ میرے خوش صفت الطافؔ ان میں ہے مہک
پہنچا میں اُس کی راہ میں، آئینے سارے توڑ کر

○○

بھرا میلہ تھا لیکن وہ کہیں چہرا نہیں تھا
مرے حصے کا سپنا تھا مگر میرا نہیں تھا

بھرے ساون میں جھولے، پیڑ، کوئل، سارے روٹھے
صدائے بین تھی گاتا کوئی سہرا نہیں تھا

اک اشکِ آرسی میں کس قدر تھیں صورتیں کل کی
کسی پہلو میں بھی، پیکر مگر تیرا نہیں تھا

بٹا تھا دائروں میں اَن سنی آواز کردی
مری تقسیم سے روٹھا تھا وہ بہرا نہیں تھا

رُکا تھا وہ کسی محبوب کی خاطر مگر اب
کسی مجنوں کی خاطر وقت یہ ٹھہرا نہیں تھا

بکھرتی چاندنی میں، ٹھنڈی ریتلی زمیں پر
جہاں دیوانے پھرتے تھے یہ وہ صحرا نہیں تھا

OO

مجھے رہ رہ کے تڑپاتے ہیں تیری یاد کے جھونکے
رُلا کر خون برساتے ہیں تیری یاد کے جھونکے

کبھی وہ ہجر کی تاروں کو کھل کر تاؤ دیتے ہیں
کبھی یخ بستہ ہوجاتے ہیں تیری یاد کے جھونکے

کتابوں اور گملوں کی مری ترتیب بدلی ہے
تبھی تو برہمی لاتے ہیں تیری یاد کے جھونکے

خدا جانے ملن ہوگا ہمارا کن رتوں میں اب
انہی سوچوں میں الجھاتے ہیں تیری یاد کے جھونکے

رفو کر لینا اپنا پیرہن تم اس کی آمد پر
لباسِ وصل پہناتے ہیں تیری یاد کے جھونکے

کبھی اک چاند سے سیڑھی لگا کر بھی اترتے ہیں
بہت سہلا کے بہلاتے ہیں تیری یاد کے جھونکے

کبھی الطاف وہ آتے ہیں اک پروائی کی صورت میں
گلِ خوش رنگ برساتے ہیں تیری یاد کے جھونکے

OO

ہمارے پیڑ کی بڑھتی رہی کئی شاخیں
گلی میں تازہ مہک بانٹتی رہی شاخیں

غزل تو گاؤں کی اک چلبلی حسینہ ہے
وہ جھولتی ہے، شجر کی ہیں جھولتی شاخیں

عجیب شخص تھا مجھ کو بٹھا کے سائے میں
تراشتا ہے سکوں سے وہ دھوپ کی شاخیں

بہار برف خزاں رنگ موسموں کے نقوش
نگر نگر میں ہیں پھیلی یہ گاؤں کی شاخیں

وہ سایہ دیتی ہیں الطافؔ تپتے موسم میں
ہمارے گاؤں کے ہر پیڑ کی گھنی شاخیں

OO

وہ ہم پہ کرنے لگے ہیں عنایتیں کیا کیا
پڑیں ہیں ٹوٹ کے ہم پر قیامتیں کیا کیا

ہمارے دوست ہمیں وحشتوں میں چھوڑ گئے
تھی اُن کی باتوں سے ظاہر شرافتیں کیا کیا

ہوئے ہیں اشک رواں اِن ہماری آنکھوں سے
لرزتے قطروں میں گونجیں شکایتیں کیا کیا

کسی کو حسن دیا ہے یہاں کسی کو عشق
خدا نے سونپی ہیں ہم کو نیابتیں کیا کیا

یہ ایک بات تجھے ہوگی سوچنی الطافؔ
کہ تیرے پیچھے ہوئی ہیں بغاوتیں کیا کیا

○○

بے کلی کل تھی جو دل میں سو وہی آج بھی ہے

مرے آئینے میں بیٹھی وہ چھپی آج بھی ہے

باندھ لی تھی جو دوپٹے کے کسی کونے میں

اُس کی آنکھوں میں وہ منت کی نمی آج بھی ہے

گھیرے رکھا تھا جسے پیار کے اک کاغذ نے

زندگانی میں وہ پتھر کی کمی آج بھی ہے

اب بھی اُگ پائے گی کچھ فصل انہی کھیتوں میں

آ بھی جا میری محبت میں نمی آج بھی ہے

تری چنری جو نشانی ہے ہمارے پیماں کی

کسی درگاہ کی جالی پہ بندھی آج بھی ہے

OO

میری سانسوں سے بھی محبوب تھے محبوب مرے
وہ جو دُنیا سے بہت خوب تھے محبوب مرے

تم نے منسوب کیے ہیں جو مری ذات کے ساتھ
وہ کسی اور کے عیوب تھے محبوب مرے

سنگ جن پہ برستے تھے گلی کوچوں میں
وہ ترے عشق میں مجذوب تھے محبوب مرے

لفظ، اسلوب، کنائے ہو غزل یا ہو نظم
سب ترے واسطے مکتوب تھے محبوب مرے

یہ خد و خال، بناوٹ، یہ جسم اور یہ ہونٹ
میرے دل کو یہی مطلوب تھے محبوب مرے

پھر کسی اور کی محفل میں نہیں گونجے کبھی
ساز و چنگ تجھ سے ہی منسوب تھے محبوب مرے

خواہ وہ عشق کا ہو ذکر کہ ہو حسن کی بات
ترے الطاف کے اسلوب تھے محبوب مرے

OO

میں تیرا ہوں مرے الفاظ کاغذ اور قلم تیرا
خوشی میری جو تیری ہے، مرا غم بھی ہے غم تیرا
کوئی بھی چھین کب پائے گا مجھ کو تیری آنکھوں سے
مری بینائی تیری ہے مرا یہ دیدہ نم تیرا
نہ جھپکے ایک بھی پل آنکھ اس دنیا کے لشکر سے
مجھے اونچا بہت رکھنا ہے یادوں کا علم تیرا
جو مجھ سے دور بیٹھا ہے کلیجے کا ہے اک ٹکڑا
تصور دل کی دھڑکن میں بسا ہے ہو کے ضم تیرا
میں جب بھی دیکھتا ہوں اُس میں اس کی شکل ہوتی ہے
ترے الطاف آئینے میں ہے جو تھا صنم تیرا

OO

اُسے تو آج آنا تھا چراغِ صبح سے پہلے
کوئی وعدہ نبھانا تھا چراغِ صبح سے پہلے
دیا روشن رہا جلتے رہے پروانے رک رک کے
یہی اپنا فسانہ تھا چراغِ صبح سے پہلے
عجب سا نور بھر دیتی ہے الفت دل کی دنیا میں
یہ اشکوں میں سُنانا تھا چراغِ صبح سے پہلے
سبھی ڈھلتے گئے ہیں اپنی عمروں کے حسابوں سے
یہاں کس کا زمانہ تھا چراغِ صبح سے پہلے
ابھی الطافؔ اس کشتی میں پھر سے رات کرنی ہے
یہ دریا ہی ٹھکانہ تھا چراغِ صبح سے پہلے

OO

وہ مصور مرا، میری تصویر سا، بوئے عنبر تھی یا گل نما آگئی
تھی اُسی کی پھبن، اُڑتا سا پیرہن، آب شاروں کی کوئی صدا آگئی
کچھ ہواؤں میں تھا اُس کا پیغام سا، جو کواڑوں سے سر کو پٹختا رہا
لفظ تھے یاں قلم کی زباں سے رواں ، دردِ زہ تھا کہ اسکی دوا آ گئی
برف کا خوش نما، وہ نمودِ بتاں، ایک تخلیق سا، جس کو دی تھی قبا
ہوش تھے باختا، دور کی فاختا، ایک ان دیکھی سی دِلربا آگئی
بھیگا بھیگا سماں، آنکھیں برسی یہاں، ہجر کی چاندنی میں تھے نشتر یہاں
زخم ایسے سہے، پھول تھے ادھ کھلے، جن کے بہتے لہو سے ضیا آگئی
مرے الطاف سحر کو، اُس کے انصاف کو، وقت کے سنگ ریزوں نے زخمی کیا
سبز خوابوں کی وہ، میرے سازوں کی وہ، تھی طلب جس کی اب تک دعا آگئی

○○

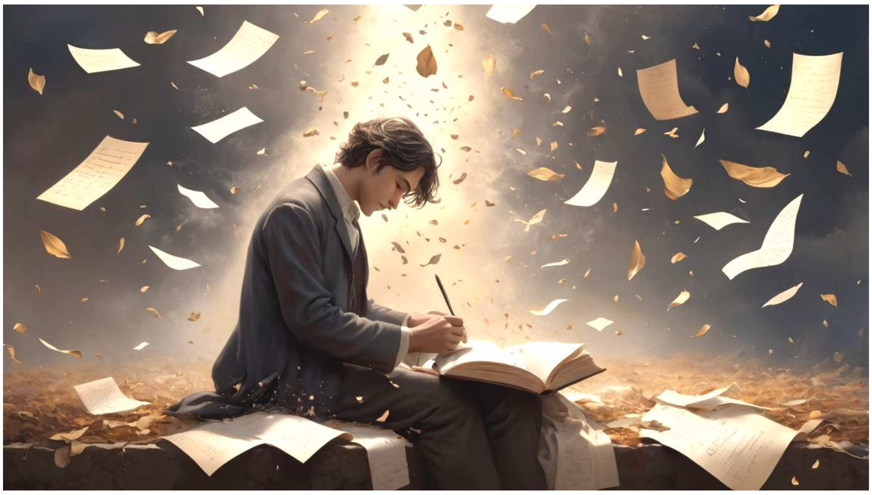

وہ سلگتا رہا ، طنز کرتا رہا ، محفلِ غیر میں بیر کرتا رہا
میں بھی سُنتا رہا، شعر کہتا رہا، ساحروں کی طرح زیر کرتا رہا
میں شناور بنا، تہ میں پھرتا رہا، لفظ گہرے سمندر سے چنتا رہا
کوئی سایہ سا تھا، میرے پیچھے رہا، میں جہانِ غزل سیر کرتا رہا
کوئی افسانہ تھا جو سُنانا بھی تھا، قاتلوں سے جسے پھر چھپانا بھی تھا
اُن کے کرداروں نے، لی ہے راہِ فرار، میں ہمیشہ یونہی دیر کرتا رہا
اُن کے سجدے حسیں، ملتوں کے امیں، وہ جو الطاف ہیں اس زمیں پہ کہیں
کوئی معصوم سا، شیر پیتا ہوا، جو لہو سے چمن سیر کرتا رہا

OO

تیرگی میں راہ دکھلاتی ہوئی وہ کیا گئی
صبحِ دم کی پھڑ پھڑاتی شمع منزل پا گئی

دل کی ہانڈی میں ابلتا خون تھا اشکِ رواں
وصل کیا تھا جسے پا کر خوشی شرما گئی

زخم خوردہ ہے زمیں، بس آگ ہی اب آگ ہے
دودھ پیتے نونہالوں کو زمیں کیا کھا گئی

مے کشی میں کچھ ہیں گم کچھ ہیں ربابوں میں مگن
ہر طرف اب شہر میں بس اک گھٹا سی چھا گئی

کیوں برستے ہی نہیں اُس سوچ پر آتش کے سنگ
خون کے دریا پہ جو کشتی چلا کر آ گئی

اس سوا نیزے کے سورج میں یہاں الطاف اب
پھول تو پژ مردہ تھے ہی ہر کلی مرجھا گئی

○○

تو رگِ جاں میں ہے پوشیدہ کسی جاں کی طرح
درد تیرا مری آغوش میں ہے ماں کی طرح
من کے حالات کو پڑھتا ہوں ہر اک چہرے سے
میں یہاں رہتا ہوں شاید کسی مہماں کی طرح
یہ خزانے تو ہیں تختِ سلیماں کی طرح
یہ خزانے ہیں نگاہوں میں بے زباں کی طرح
موت برحق ہے اگر تو ہے زمیں بھی قائم
کھو نہ دینا مری مٹی کو تم ایماں کی طرح
وہ ہے الطافؔ رہا سوچ کے پرتوں میں کہیں
ہے جو لفظوں میں نمایاں کسی انساں کی طرح

OO

یوں سلگتا ہوں تری یاد میں صندل کی طرح
بہہ نہ جاؤں تری آنکھوں سے میں کاجل کی طرح

بول پڑتی ہیں یہ ساون کی رتوں میں اکثر
غم چھپاتی تری آنکھیں کسی بادل کی طرح

لوریاں گود میں ماں لیتے ہوئے گاتی تھی
ڈھانپ لیتی ہے تری یاد اُسی آنچل کی طرح

تم بیاں درد اگر اپنا ہوا سے کرتے
میں فضاؤں میں سُنا کرتا وہ مرسل کی طرح

ترے ہاتھوں کی حرارت ہے مرے بالوں میں
اور بدن میں تری خوشبو کسی جنگل کی طرح

لوٹ آؤ، مرے پنچھی کی طرح پھر الطاف
میرے آنگن میں چہکتے رہو چنچل کی طرح

OO

درد کے تار کو میرے بیمار کو کوئی آواز دو
روح بے چین ہے اپنے کردار کو کوئی آواز دو

لوٹ کر وہ نہ آئے گا واپس کبھی راستہ ہے وہی
روٹھ جاتے ہوئے تم اُسی یار کو کوئی آواز دو

بھر کے مشکیں یونہی تم نہ گھوما کرو تپتے صحراؤں میں
تشنہ لب عشق کے تم طلب گار کو کوئی آواز دو

درد میں ڈوبے لفظوں کو چنتے ہوئے، اور سنتے ہوئے
ہو مداوا کوئی ایسے اشعار کو کوئی آواز دو

نیم بنیاد پر گھر کی تعمیر کا ہے نیا سلسلہ
تم مرے شہر کے روٹھے معمار کو کوئی آواز دو

یوں تو کھانے کی خوشبو گلی میں چلی اور محلے میں بھی
تم گلی میں کسی بھوکے نادار کو کوئی آواز دو

درد کی ہو چبھن، جاگے ترا یہ تن ایسا الطافؔ بن
دور چلتے ہوئے راہ کے خار کو کوئی آواز دو

اشک میں ڈوبے ہوئے درد کے نغمات نہ دو

سازِ دل اب ہے شکستہ نئے صدمات نہ دو

وہ جو دریا کے کنارے پہ بسا تھا اک شہر

خون وہ تھوکتا ہے ظلم کی خیرات نہ دو

اب ابابیلوں نے بدلے ہیں ٹھکانے اپنے

آس پہ اُن کی دل و جان پہ ضربات نہ دو

یہ بھی کیا کم ہے کہ موجود ہیں وہ اب تک خود میں

عشق کا جام لئے ہیں اُنہیں خطبات نہ دو

ہم بھی الطافِ محبت میں ہیں شامل اُن کے

عشق سودا ہے، جنوں ہے اسے تہمات نہ دو

OO

عروج میں آئینے کو دیکھو زوال میں تو عذاب ہوگا
سگِ نفس کو لگام دو پھر کمال میں تو عذاب ہوگا

اگر گرجتے ہو جنگلوں میں، تو چال اپنی سنبھل کے چلنا
جو آدمی کی کمند میں آؤ تو جال میں تو عذاب ہوگا

وہاں اکیلے ہی دینے ہونگے، حیات کے امتحان سارے
جواب اپنے ابھی سے سوچو سوال میں تو عذاب ہوگا

نہ بسترِ ہجر میں ابھی سے، یہ گوہرِ اشک رائیگاں ہوں
اگر نصیبوں سے وہ ملے تو وصال میں تو عذاب ہوگا

سخن وری کھیل ہے کوئی کیا، یہ کوئی میرؔ و اسدؔ سے پوچھے
ہے سوچ میں اعتدال لازم اُبال میں تو عذاب ہوگا

یہ کوئی رقص و سرود ہے کیا، اگر نہ ہو سحرِ عشق درمن
جو تھاپ اور پاؤں مِل نہ پائیں دھمال میں تو عذاب ہوگا

غزل کے الطافؔ زیر و بم میں، سروں کے سارے ہی سرگموں میں
جو ڈوبنا ہے، ہو گہرا پانی اُچھال میں تو عذاب ہوگا

○○

ہجر میں اور فراق میں اب تک تیرے غم کی تلاش باقی ہے
جام و مینا کو جو بھی شرمائے ایسے سم کی تلاش باقی ہے
زندگی کے سفر کی راہوں میں دوستی کی عمیق باہوں میں
گھپ اندھیروں میں ساتھ دے پائے، ہم قدم کی تلاش باقی ہے
بھیگ جاتے ہیں چاک دامن کے، ہیں کسی اور ہی کے ساون کے
جو سرِ عرش آہ لے جائے چشمِ نم کی تلاش باقی ہے
سانس کی لے میں گونجے پھر نغمے، عشق کا کوئی ایسا دل دے دے
جس کی ہر تار میں ہو ذکر ترا، ایسے دم کی تلاش باقی ہے
کوئی اپنا تھا یا پرایا تھا، یا کہ الطافؔ ایک سایہ سا تھا
وہ جو اٹھ کر گیا ہے پہلو سے، اس صنم کی تلاش باقی ہے

OO

کلی کی اور بادلوں کی پیاری نزاکتیں ہیں
ترے بدن سے چرائی ساری شرارتیں ہیں
نہ غوطہ زن تھے نہ ڈوبے وہ پانیوں میں سارے
اداس نسلوں پہ بارشوں کی سخاوتیں ہیں
جسے نکالا تھا آبرو تار تار کر کے
وہ لوٹ آئے گا پھر نگر میں کہاوتیں ہیں
یہ حسن کے ہیں نقیب اب کے رقیب سارے
محبتوں کے نصیب میں بس عداوتیں ہیں
وہ پھول چہرہ کلی سا جو بن رتوں کی چلمن
کسی سے ملتی نہیں یہ کیسی شباہتیں ہیں

OO

کس دیس کی ہوا میں وہ پیارا چلا گیا
آنکھوں سے لے کے خواب ہمارا چلا گیا

اس زندگی کی ریل کے پیچھے تمام دن
میں دوڑتا رہا کہ اشارا چلا گیا

دستک کی تیری زندگی بھر میں منتظر رہا
میں گھر میں تھا کہ کوئی ہمارا چلا گیا

پہلے بھی یہ کہا تھا ابھی پھر کہیں گے سُن
دریا تو رک گیا ہے کنارا چلا گیا

تاریک بادلوں نے چھپائی ہے روشنی
تھا رات کو چمکتا ستارا چلا گیا

ہم جس میں دیکھتے تھے یہ فردا کے واقعات
الطافؔ آینۂ وہ ہمارا چلا گیا

OO

سنور چکی تھی جو وہ عمارت اجاڑ دی ہے
تری محبت نے میری عادت بگاڑ دی ہے
دوکاں سے جس میں متاعِ فردا میں لے کے آیا
وہ جیب بچوں نے گھر میں آتے ہی پھاڑ دی ہے
جہاں پہ ارماں تھے، خواب تھے سب نئے پرانے
کسی نظر نے وہ ساری بستی اجاڑ دی ہے
ہماری روٹی ، ہماری خوشبو ، ہمارا زر تھی
وہ زعفراں کی زمیں کسی نے لتاڑ دی ہے
سبھی ہمارا یہاں پہ الطاف کیا ہے تیرا
ہوس کی دوڑوں میں ہم نے کرگس پچھاڑ دی ہے

OO

جو بھی اس عشق میں فنا ہوگا
اس کی دھڑکن میں بس خدا ہوگا

سارا کعبہ سمٹ کے آئے گا
ایک دن ایسا معجزہ ہوگا

لوحِ محفوظ کا یہ تیرا غم
میری تقدیر میں لکھا ہو گا

شب کی گہری دبیز چادر میں
صبحِ نو کا بھی زر چھپا ہوگا

ناز جس پر گلاب کرتے ہیں
پھول وہ ترے گجرے کا ہوگا

یاد میری بھی آئی ہوگی تجھے
نام میرا بھی کیا لیا ہوگا

کیسی خوشبو وہ زلفِ یار میں ہے
کس کو الطافؔ یہ پتا ہوگا

عاشق ہے مگر، ہوش سے مفرور نہیں ہے
وہ دشتِ نوردا ، کوئی منصور نہیں ہے
ایسا بھی ہے اک شخص کہ جو تیری رضا سے
فاقوں سے گھرا ہے پہ وہ رنجور نہیں ہے
کچھ لوگ یہاں ایسے بھی ہیں شہرِ وفا میں
جلووں کے لئے جن کو کوئی طور نہیں ہے
کانٹوں کی طرح ہے کوئی پھولوں کی طرح ہے
جو شخص ہے مہجور وہ مجبور نہیں ہے
تم زیب کئے بیٹھے ہو تنہائی کو کیونکر
الطافِ وفا کا تو یہ دستور نہیں ہے

○○

اُس سے بچھڑتے وقت دلاسا نہیں رہا
پاسِ وفا بھی اُس کو ذرا سا نہیں رہا

جو پتھروں کو چاٹ رہا تھا وہ سخت جاں
پانی پلٹ کے لایا تو پیاسا نہیں رہا

خود کھیل میں بٹھایا تھا اُس ناب کار کو
اب چال کے پلٹنے کو پاسا نہیں رہا

سکّے اُچھالتے ہو بھلا کس لئے یہاں
ہاتھوں میں اپنے کوئی بھی کاسہ نہیں رہا

الطافؔ کس کی آس میں چھانی گلی گلی
اس شہر میں تو کوئی شناسا نہیں رہا

OO

وفا کی کیسی یہ منزلیں ہیں، نچوڑا ہے یہ کس کے غم نے ہم کو
میں آج بھی اُس جگہ کھڑا ہوں، جہاں پہ چھوڑا صنم نے ہم کو

سلگتے صحرا میں پھر رہا ہے مری محبت کا پیاسا آہو
ہیں تشنہ لب جلوہ ہائے لیلیٰ، یہ کیا کیا ہے صنم نے ہم کو

بدن پہ زخموں کی کہکشاں ہے، لباس رنگیں گلوں سی خوشبو
درونِ خانہ ہے رقص کیسا، یہ پوچھا ہے اُس ستم نے ہم کو

ہوئی ہے بنجر زمیں ہماری، کی اُس قلم نے ذرا سی حرکت
ملے گی کب اب یہاں پہ روٹی، کہا ہے اکثر شکم نے ہم کو

وفا کے نعروں کی گونج ہو یا نظام و انصاف کی صدائیں
دیا ہے پل پل فریب اُس نے بدلتے رنگیں علم نے ہم کو

مرے تخیل کے آسماں پر ہے اک ستارہ کسی کے جیسا
زمینِ دل پر کیا منور، اُسی کے نقشِ قدم نے ہم کو

ابھی تلک ہم وہی ہیں بھائی، جو یوسفِؑ غم شعار کے تھے
ترے اخی کا لہو بہا ہے، صدائیں دی ہیں حرم نے ہم کو

لہو کی دھاریں برس رہی ہیں، ہماری اقصیٰ کے گنبدوں سے
نگاہیں الطاف کور کی ہیں، یہ کیسے دام و درہم نے ہم کو

○○

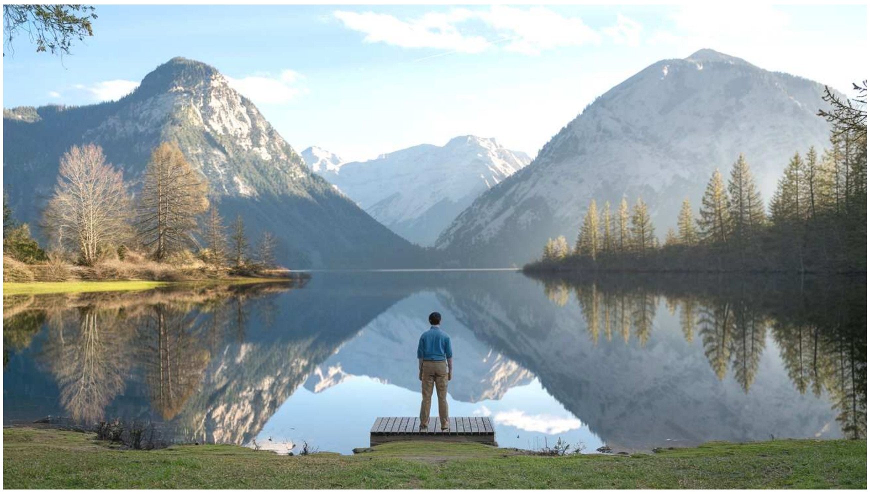

جو سفر کوئے یار کرتے ہیں
سارے لوگوں سے پیار کرتے ہیں

موسموں کا شمار کرتے ہیں
بے وفاؤں سے پیار کرتے ہیں

وہ شبِ وصل آ بھی جائیں اگر
غم نہیں ہم اُدھار کرتے ہیں

وہ نہ آئیں گے اپنی محفل میں
بے سبب انتظار کرتے ہیں

جن کو الفت شہید کرتی ہے
زندگی کی بہار کرتے ہیں

بعد میں دل کھینچتے ہیں دل میرا
پہلے آنکھوں پہ وار کرتے ہیں

اُن کی اُس زلفِ شب دراز پہ اب
رت جگے ہم نثار کرتے ہیں

برف کے بت بنے رہو تم بھی
ہم بھی دریا کو پار کرتے ہیں

ہم کو الطافؔ یہ تو سمجھاؤ
کیا تمہیں وہ بھی پیار کرتے ہیں

OO

اُس سے قول و قرار ہی کب تھا
ہم سے کرتا وہ پیار ہی کب تھا

میں تو مہماں تھا تری نگری میں
یہ تو میرا دیار ہی کب تھا

تیر مارا غلط نشانے پر
وہ شکاری ، شکار ہی کب تھا

یونہی بیٹھے گلی کے نکڑ پر
یہ ترا انتظار ہی کب تھا

میں فسانہ بنا رہا تھا کوئی
ورنہ تجھ پر نثار ہی کب تھا

تھی مصور کی کوئی کاری گری
ورنہ الطافِ یار ہی کب تھا

○○

عجیب درد ہے اب کے اُڑان میں شاید
ہے ٹوٹ پھوٹ بھی دل کے مکان میں شاید

سفر ہے متھرا و کعبہ کا اُس کی جیبوں میں
زمیں کا عرق ہے شامل لگان میں شاید

کمر کماں کی طرح اور چہرے پر جھریاں
سفر ہے عمر کا اب کے ڈھلان میں شاید

وہ کیا گیا کہ زمان و مکان روٹھ گئے
تھا ایک شخص وہ سارے جہان میں شاید

کچن میں اب ہے پُرانے سے برتنوں کا ہجوم
ہیں ساری صدیاں ہمارے مکان میں شاید

وہ لے کے جائے گا الطافؔ دورِ ماضی میں
کبھی نہیں تھا کسی کے گمان میں شاید

○○

نہ تھم پائیں گے یہ بادل کبھی تم سے جدا ہوکر
ہَوا ہو جائے گی پاگل کبھی تم سے جدا ہوکر

یہ زیور عشق کے مٹی میں بھی محفوظ ہی ہونگے
نہ بن پائیں گے یہ پیتل کبھی تم سے جدا ہوکر

نہ چھولیں گے کبھی لب سے تمہارے شوخ رنگوں کو
ہوا جب تھام لے آنچل کبھی تم سے جدا ہوکر

نہ پیڑوں پر ردا ہوگی نہ پھر پوشاک کب ہوگا
نہ ہوگی زیبِ تن مخمل کبھی تم سے جدا ہو کر

نگر ہوں گے نہ پھر رستے چمن ہوں گے نہ گل ہوں گے
اُگیں گے ہر طرف جنگل کبھی تم سے جدا ہو کر

ستارے ڈوب جائیں گے قمر پردے میں تب ہوگا
جلائیں در پہ ہم مشعل کبھی تم سے جدا ہو کر

شبِ تاریک کی الطاف جھک جائیں گی تب پلکیں
بہے گا آنکھ سے کاجل کبھی تم سے جدا ہو کر

OO

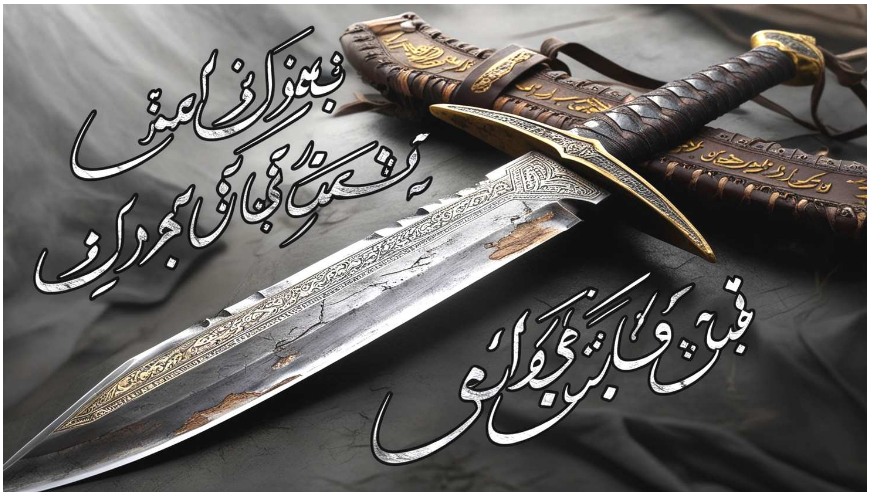

ہوتی ہے زندہ وقت کی شمشیر میں حیات
بہتی ہے نغمہ بن کے یہ تقطیر میں حیات

تھا لوچ اس میں اور غمِ روز گار بھی
اُلجھی تھی کسی کی زلفِ گرہ گیر میں حیات

معشوق کون ہے بھلا عاشق کہیں کسے
گزری ہے ایک عشق کی تفسیر میں حیات

شب بھر چراغ جلتے رہے قبر پر وہاں
اب بھی کہیں کہیں تھی دل گیر میں حیات

جب روزنوں سے جھانکتی ہے صبح کی کرن
اُس لمحے رقص کرتی ہے زنجیر میں حیات

الطافِ زندگی میں یہاں جاگتے ہوئے
یہ کون سے ہے خواب کی تعبیر میں حیات

OO

یہ ہے پتھروں کی زمیں مرے، یہاں پھول کیسے اُگائیے
یہاں تنگ ذہنوں کے ہیں مکیں، نہ قضا گلے سے لگائیے
یہ حیات و موت کی راہ ہے، نہ کسی کو تیری ہی چاہ ہے
جہاں سائے چھوڑ کے جاتے ہیں، وہاں آئینے نہ سجائیے
نہ صبا، نہ صبح، نہ شام ہے، نہ کسی کو تجھ سے ہی کام ہے
یہاں در ہے نا کوئی روشنی، ہو دیا تو ساتھ میں لائیے
وہیں زندگی کی دلیل ہے، وہ جو دُور اِک سنگ میل ہے
نہ وہاں پہ کوئی سبیل ہے، سرِ راہ کچھ تو اُٹھائیے
نہ ہوا نوا، نہ ہی یہ فضا، نہ چمکتا تیرا یہ بت کدہ
کوئی ہے یہاں پہ ہمارا کیا، جسے آ کے اپنا بنائیے

○○

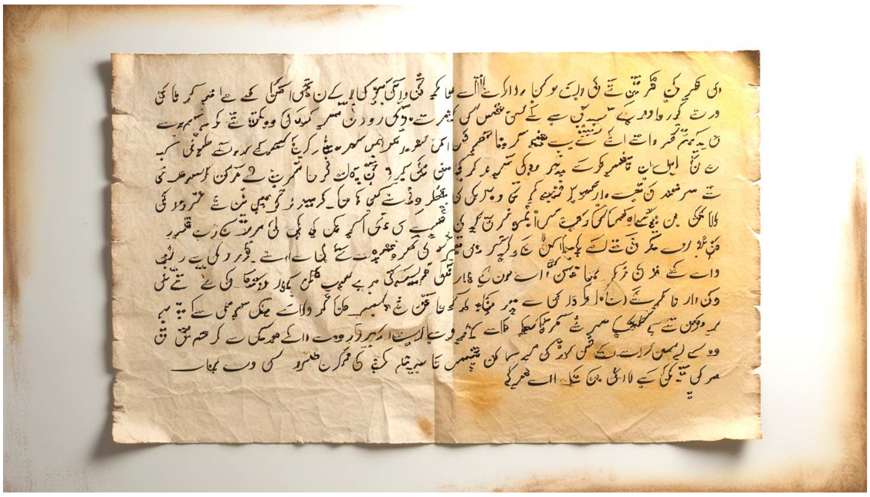

ہر طرف ہر نگر بے صدا بام و در
سبز خوابوں کا گھر بے صدا بام و در

رینگتی اب نہیں کاغذوں پر سطر
لفظ ہیں تر بتر بے صدا بام و در

آنکھیں خاموش ہیں گوش برشور ہیں
لب تو ہلتے ہیں پر بے صدا بام و در

اُس مکاں میں کبھی الفتیں تھیں مکیں
چیرتے ہیں جگر بے صدا بام و در

دیکھنے آئے تھے وہ گلی سے اِدھر
ہیں دریچے مگر بے صدا بام و در

نغمگی ہے اُدھر ساز و آواز بر
دل کا کمرہ اِدھر بے صدا بام و در

آج الطافؔ پر کوئی پتھر نہیں
تیرے شیشے کا گھر بے صدا بام و در

○○

بکھری ہے اگر بو تو کہیں ناف تو ہوگا
ملتا نہیں ہے سامنے اطراف تو ہوگا

قاتل بھی ، منافق بھی ، غدار بھی ہم ہی
انصاف کے مالک ، ترا انصاف تو ہوگا

بوسیدہ بہت ہوچکا یہ تیرے جہاں میں
میوا تری امت کا کبھی صاف تو ہوگا

امت کے دلوں میں یہ سگ دہر بسا ہے
بہہ جائے لہو جسم سے شفاف تو ہوگا

ہر معرکے میں ہار کر خاموش نہیں ہے
اب رن میں عدو کا نیا اہداف تو ہوگا

ہیں خوار سبھی نفس کے بیمار زمیں پر
پاسِ نبی ﷺ تیرا ہمیں انصاف تو ہوگا

رنگیں ہے لہو سے یہ فلسطین کی دھرتی
فوجوں میں چھپا یہ ترا الطاف تو ہو گا

OO

پردہ نشیں سے وہ جو قبا چھین رہے ہیں
آنکھوں میں بچی جو تھی حیا چھین رہے ہیں

غیرت ہوئی نیلام سرِ عام یہ سرکش
گھر بھر سے کوئی جلتا دیا چھین رہے ہیں

کردار سے ہی تیرے، تمہارا یہ حرم بھی
ہم تم سے تمہارا ہی خدا چھین رہے ہیں

اک خوف سا پھیلا ہے یہاں سارے دلوں میں
پرکھوں کے محبت کی کتھا چھین رہے ہیں

جرأت ہے وہ بیمار سی دنیا کی ہوس میں
ہونٹوں سے ہمارے وہ دعا چھین رہے ہیں

وہ کر رہے ہیں ہم پہ جفا اس کا گلہ کیا
الطاف وہ تو رسمِ وفا چھین رہے ہیں

OO

پنچھی اُڑے سبھی کوئی سایا نہیں رہا
اب صحن میں وہ یاد کا بوٹا نہیں رہا

کچھ اور چہرے آ گئے ہیں آئینے میں اب
میں بھی تو اس نگاہ میں تنہا نہیں رہا

برقیں چُرائیں اُس سے چڑھاتا ہے منہ مرا
تھا اک چناب جو ابھی دریا نہیں رہا

جانے رہا ہے کون وہ پہلو میں عمر بھر
تنہا بہت رہا ہوں میں یکتا نہیں رہا

دریا رواں تھے اشک ندامت کے بے شمار
صحرا کی تپتی دھوپ میں پیاسا نہیں رہا

تیرے سمندروں سے پرے شور تھا بہت
تجھ سے ملا تو پھر میں وہ دریا نہیں رہا

اک عمر سے طلب تھی مجھے چاندنی تری
پورا ہوا جو چاند میں آدھا نہیں رہا

الطافؔ کس نے چھین لیا ہے مکان سے
مٹی کا، گھر میں اب کے وہ چولہا نہیں رہا

○○

دفینہ یادوں کا تیرا میرا، چنار کی ایک چھاؤں میں تھا
جگہ وہ کھوئی کہاں پہ ہوگا، مگر وہ میرے ہی گاؤں میں تھا
مجھے نکالا ہے جب سے تو نے، پھرا ہوں دنیا کے کونے کونے
میں رُک بھی پاتا کہیں پہ کیسے، سفر کا نقشہ ہی پاؤں میں تھا
گواہ اپنی ہے لاش خود ہی، ہے قتل کی واردات کس کی
تھی جائے مقتل پہ دھوپ ہر سو، مگر وہ مقتول چھاؤں میں تھا
قدم قدم پر دعا تھی جن کی، سفر میں پل پل صدا تھی اُن کی
نہیں ہے در تک بھی ساتھ کوئی، وہ درد سارا تو ماؤں میں تھا
وہ دور ہیں دید کی حدوں سے، تمام الطاف سرحدوں سے
دوا تو لائیں ہیں دوست سارے، اثر تو کسی کی دعاؤں میں تھا

OO

میں تیرے لئے آج بھی انمول رہی ہوں
ہے شکر کہ میں لہجہ ترا بول رہی ہوں

سرحد سے یہاں جیت کے وہ جنگ تو آئے
آنگن میں لئے برگِ حنا گھول رہی ہوں

پیمانے ہی ملتے نہیں ہیں سارے جہاں میں
بابا کی محبت کو بہت تول رہی ہوں

سوکھا ہی سہی پھول لڑکپن کا کہیں ہے
ماضی کی کتابیں میں ابھی کھول رہی ہوں

بابل کے ذائقے کو بھلانے کے لئے اب
نمک کبھی شکر میں خود کو رول رہی ہوں

میں پیار ترا دور سے پہچان لیتی ہوں
شاید کہ اسی واسطے کشکول رہی ہوں

گزرے گا وہ الطافؔ ابھی میری گلی سے
یادوں کے دریچوں کو جبھی کھول رہی ہوں

OO

زلف کو سنورنے میں دیر تو لگی ہوگی
آئینے کو چھلنے میں دیر تو لگی ہوگی

اُس نے چائے ڈالی ہے زندگی کے پیالے میں
سب نشہ اُترنے میں دیر تو لگی ہوگی

گھر نہیں مِلا مجھ کو آج بعد مدت کے
شہر کو بکھرنے میں دیر تو لگی ہوگی

عمر بھر کی جھریوں کو وقت میں چھپانے کو
اُس کو پھر نکھرنے میں دیر تو لگی ہو گی

قبر سے صدا آئی میری نسل کے لوگو
صبحِ نو بکھرنے میں دیر تو لگی ہوگی

خون سے میں خط لکھتا سب رگیں ہوئی خالی
اشک پھر اُترنے میں دیر تو لگی ہوگی

تندسی ہواوں میں تیری راہ میں الطاف
قیس کو گزرنے میں دیر تو لگی ہوگی

OO

اس پار کے ہم پر حسیں احسان بہت تھے
سینچے لہو سے کھیت کہ نادان بہت تھے

فصلیں ہی اُبھر آئیں ہیں اب سرخ یہاں پر
دھرتی تھی ہماری یہاں دہقان بہت تھے

تم نے تو وفا ہم سے کبھی کی ہی نہیں ہے
ہم لوگ اسی بات پہ حیران بہت تھے

وہ صبح کبھی آئے گی اک روز ہماری
سوئے جو ہیں یہ اپنے بھی ارمان بہت تھے

وہ زخم ہیں ناسور جو پھولوں نے دیے ہیں
وہ یار ہی ایسے کہ یک جان بہت تھے

گو نگے تھے کہاں سارے وہ الطافِ سخن کم تھے
لفظوں کے تو معمول میں طوفان بہت تھے

○○

نفرت کو تیرا پیار لکھوں یہ نہیں ہوا
دامن کو تار تار لکھوں یہ نہیں ہوا

ایسا جدیدیت کا لکھاری نہیں ہوں میں
سائے کو زلفِ یار لکھوں یہ نہیں ہوا

جو کچھ ہیں خدوخال ترے ان کا ذکر ہو
صحرا کو آبشار لکھوں یہ نہیں ہوا

پرتوں کو کھولنے کی بھی فرصت کہاں رہی
صد رنگ کی بہار لکھوں یہ نہیں ہوا

دل میں بسا کے تیری جدائی کی داستاں
سوز دروں کو یار لکھوں یہ نہیں ہوا

ڈوبی ہوئی پسینے میں گرچہ ہے زندگی
اشکوں کی بہتی دھار لکھوں یہ نہیں ہوا

پردیس کا وہ پنچھی ابھی تک نہیں مڑا
اس کو رتوں کی ہار لکھوں یہ نہیں ہوا

سکوں کی مالا جپتا رہا دین کا سپاہ
کیسے اسے زنار لکھوں یہ نہیں ہوا

ایسے بنے ہمارے عمل اب جہاں میں
اس کو خدائی مار لکھوں یہ نہیں ہوا

ارض وسما پہ پھول کھلے ہیں ہر اک طرف
الطافؔ اس کو خار لکھوں یہ نہیں ہوا

OO

ہماری چشمِ بصیرت میں آگہی کم ہے
جگر کے دیپ جلاؤ کہ روشنی کم ہے

عذابِ عشق میں جینا ہی زندگی ہے مری
ذرا نظر سے پلاؤ کہ درد بھی کم ہے

بسے ہو سانس کے ہر زیر و بم میں مدت سے
تمہارے عشق کے آگے یہ قیصری کم ہے

ہر ایک شے سے ہے ظاہر قلم میں کاغذ میں
میں جس قدر بھی کروں تیری بندگی کم ہے

یہ لذتیں کہاں پاؤ گے آتے جاتے ہوئے
زیادہ اس نے پلائی کہ ہم نے پی کم ہے

صبا میں تو ہے فضا میں بھی کونپلوں میں نہاں
میں تیرا حسن نہاروں کہ شاعری کم ہے

بہت اداس ہے الطافؔ دور ہے بیٹھا
اسے بھی پاس بلا آج تیرگی کم ہے

○○

لوگ تھے پیار تھا زندگی تھی مری
شہر در شہر کی جھونپڑی تھی مری

باوری من کی تھی، اک مرے صحن میں
اُس کی الھڑ ادا، شاعری تھی مری

تختیٔ دل پہ تھا، حرف تو کی طرح
اک اسی لفظ سے، روشنی تھی مری

لب ہی کیوں سی لئے ہیں کہاں قہقہے
وہ چہکتے ہوئے بولتی تھی مری

اب ٹٹولوں کہاں دل جگر ہے کہاں
وہ درونِ بدن روشنی تھی مری

خوشبوؤں کو ہوا سے چھپاتے کہاں
کیسی الطافؔ وہ سادگی تھی مری

○○

قلم کی نوک تڑپتی ہے شاعری کے لئے
بہ ضد ہیں آنکھیں تری آج ساحری کے لئے

میں بُت تراش نہیں ہوں مگر یہ دیکھو تو
بُلا رہا ہے بدن اُس کا آذری کے لئے

میں نے کی دھن پہ ہی آواز دے رہا ہوں اُسے
صدائے چنگ بھی لازم ہے بانسری کے لئے

کٹے سپاہ بھی، انسانیت بھی راکھ ہوئی
وہ جنگ ظلم کی ہارے ہیں برتری کے لئے

اُچھلتی کودتی آنگن میں جو کہ تھی الطافؔ
میں جی رہا ہوں اُسی شوخ باوری کے لئے

○○

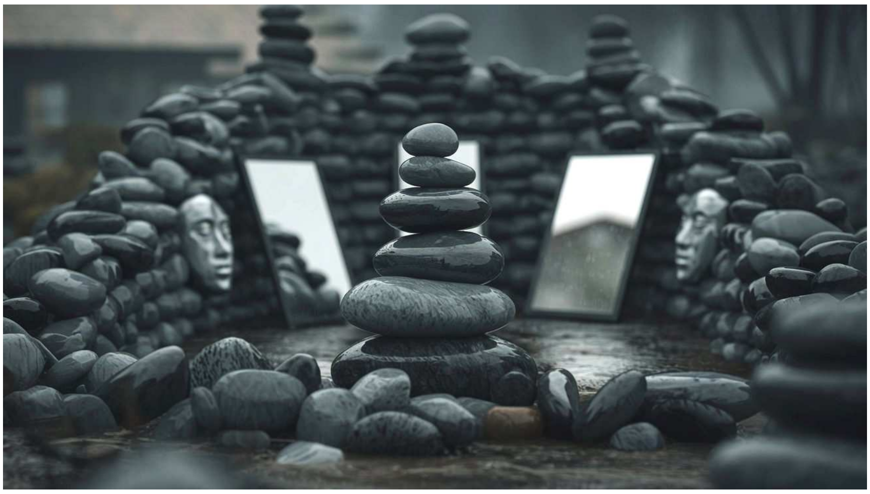

پھول جیسے آنگن میں، جب بھی کوئی لاتا ہے، کون یاد آتا ہے
وہ مہک نہیں ہوتی ، خوشبوؤں کا تانتا ہے، کون یاد آتا ہے

بارشوں کا قطرہ سا، گل پہ کوئی شبنم سا، موتیوں سا چمکا تھا
جب کسی کی پلکوں سے، اشک ٹوٹ جاتا ہے، کون یاد آتا ہے

گیسوں کے جنگل میں، جب ہوائیں چپکے سے، چھیڑ چھیڑ جاتی ہیں
انگلیاں سی زلفوں میں، کوئی سرسراتا ہے، کون یاد آتا ہے

بات تو کرو مجھ سے، کچھ نہ کچھ کہو مجھ سے، چپ نہ یوں رہو مجھ سے
بات بات پر کوئی، روٹھ روٹھ جاتا ہے، کون یاد آتا ہے

دل میں جب طلب ہوتی، وہ نگاہیں پڑھ لیتی، اور دوڑ کر جاتی
میز پر کوئی جب بھی، چائے رکھ کے جاتا ہے، کون یاد آتا ہے

شام کی سیاہی میں، پانیوں میں جب اکثر، چاند ڈوب جاتا ہے
جھیل میں کوئی چہرہ، جب بھی مسکراتا ہے، کون یاد آتا ہے

میری سوتی آنکھوں کو، دیر تک وہ تکتی تھی، کیا کبھی وہ تھکتی تھی
چاند جب کبھی شب کو، آنکھ میں سماتا ہے، کون یاد آتا ہے

جب کبھی اندھیرے میں، بجلیاں چمکتی تھیں، مجھ سے وہ لپٹتی تھی
کوئی جب دبے لب سے، گیت تیرے گاتا ہے، کون یاد آتا ہے

دن گزر ہی جاتا ہے، گھپ اندھیرے جنگل میں، یا کسی کے مندر میں
اُس کی یاد کا سورج، رات کو جگاتا ہے، کون یاد آتا ہے

○○

پل پل دل میں خواب سجائے گا تو پھر تھک جائے گا
اس کی گلیوں میں جب جائے گا تو پھر تھک جائے گا

دیکھو بس تم دور سے اس کو پھول ہو یا کوئی مورت
کوئی بت سینے پہ اٹھائے گا تو پھر تھک جائے گا

کیا وہ بالم لوٹے گا اب کے ان تیز ہواؤں میں
تو جب ہجر کے گیت سنائے گا تو پھر تھک جائے گا

بنجر دھرتی بنجر ذہنوں کو سیراب کرو گے کیا
آنکھوں سے دریا کو بہائے گا تو پھر تھک جائے گا

وقت تجھے پرکھے گا اب کے کندن ہے یا کوئی پیتل
تجھ کو پتھر پر وہ گھسائے گا تو پھر تھک جائے گا

ترے جسم کا سارا کندن صحرا میں رُل جائے گا
اپنے الہڑ خواب چھپائے گا تو پھر تھک جائے گا

کون سا رستہ ہے اک دھند ہے اور طویل سی شامیں ہیں
تو الطافؔ یہاں چل پائے گا تو پھر تھک جائے گا

○○

ہمیں تو جاگنا ہے آج کی شب صبحِ کاذب تک
کھلیں گے رحمتوں کے سارے دراب صبحِ کاذب تک

بہ کثرت توبہ، استغفار، الغفار سجدے میں
مداوا لا دوا کا ہوگا امشب صبحِ کاذب تک

بہائے جا دلِ مضطر سبھی آنسو ندامت کے
گناہوں کی دھلے یہ دھول یارب صبحِ کاذب تک

دریدہ دامنوں کو پیش کرنے کے لئے ہے کیا
شکستہ دل صدائے ہُو ہو، برلب صبحِ کاذب تک

یہ دل بیدار ہو الطافِ شب کی ان سعاتوں میں
فرشتوں کی رہے بس نور کی چھب صبحِ کاذب تک

○○

دھڑ پر ہمارے چہرے بھی چہرے نہیں ہیں اب
کوئی ہیں آئینے میں تو کوئی کہیں ہیں اب

اُونچی چٹانیں توڑ کے رکھ دی ہیں وقت نے
تھے نام جس پہ اپنے، وہ پتھر وہیں ہیں اب

میں ڈھونڈتا ہوں اُس کو وفاؤں کے شہر میں
جو گھر تھا میرا اس میں نئے ہی مکیں ہیں اب

مٹی تو اپنے کھیت کی اب تک بدن پہ ہے
اوروں کی ملکیت میں، زمینیں مری ہیں اب
جن آنکھوں میں تھیں صبحیں تو زلفیں تھیں شام کی
اے صبح کی ہوا مرے کیسے حسیں ہیں اب
گردش میں ہے زمین تو بچھڑے سبھی صنم
لوٹیں گے وہ یہیں پہ جہاں بھی مکیں ہیں اب
بوسیدہ کھنڈرات میں الطافؔ کتنے شہر
روٹھی محبتوں کے ہمارے امیں ہیں اب

OO

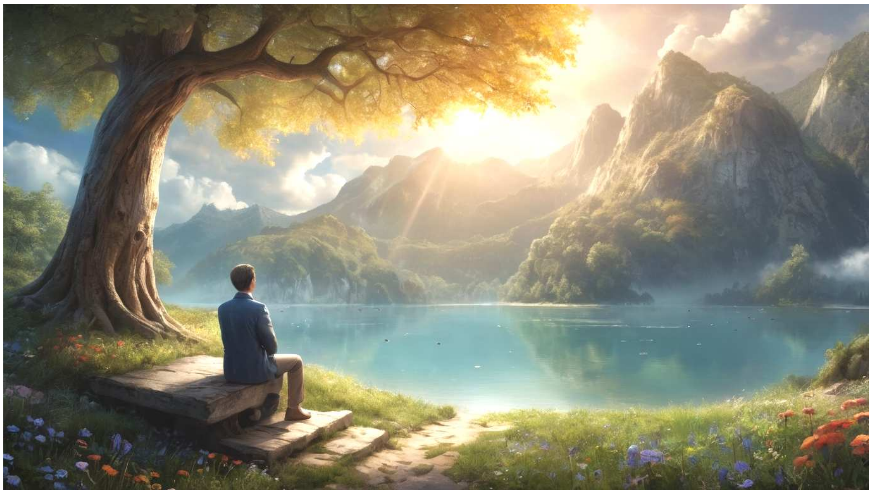

جن راہوں پہ چلے تھے وہ راہیں نہیں رہیں
تکتیں جو دور تک ـــــ وہ نگاہیں نہیں رہیں

اُس نے کیا تھا وعدہ کہ چاہیں گے عمر بھر
اب چاہتے ہوئے بھی وہ چاہیں نہیں رہیں

تاریخ بن کے طاق میں خود کو چھپاتے ہم
گھر میں کہیں بھی ایسی پناہیں نہیں رہیں

سی لیتے زندگی کا کفن خود ہی بیٹھ کر
سوزن کے ساتھ دھاگا نگاہیں نہیں رہیں

پی لیتے تلخیاں تری اے زندگی مگر
ہم کو جو تھام لیتی وہ باہیں نہیں رہیں

وہ لے گیا ہے درد کی ساری صدائیں اب
چیخیں نہیں رہیں کراہیں نہیں رہیں

الطافؔ عمر بھر جنہیں سینے میں رکھتے ہم
اِن دوستوں میں اب کے وہ آہیں نہیں رہیں

○○

مری یادوں میں نغمے بو گیا ہے
وہ گیتوں کا مُغنی سو گیا ہے

پتہ کیوں پوچھتے ہو یار کا تم
کہیں ہوگا یہاں سے تو گیا ہے

شجر جھومے چلی ٹھنڈی ہوائیں
کرامت ہے کہ ایسا ہو گیا ہے

رُتوں کی طرح ہے یہ آدمی بھی
ہے کب لوٹا یہاں سے جو گیا ہے

کہا گل چیں سے صبحِ دم گلوں نے
کہاں مالی ہمارا سو گیا ہے

نہ صبحیں ہیں نہ شامیں چپ لگی ہے
یہاں الطافؔ یہ کیا ہو گیا ہے

○○

جہاں آنکھوں پہ پٹی ہے کہاں قانون اندھا ہے
وہاں انصاف کی قیمت ہی انسانوں کا دھندا ہے

جوانی سے بڑھاپے کا سفر بس یونہی گزرا
لٹی ہے عمر کی پونجی گلے میں پھر بھی پھندا ہے

پھٹی جیبوں میں میری ایک بھی پیسہ نہیں ہے اب
ہمیں جو بھی یہاں ملتا ہے وہ بس ایک چندا ہے

اُچھالے جاتے ہیں سکے یہاں عصمت کی بولی پر
یہ بازارِ ہوس ہے اور یہاں ہر لفظ گندہ ہے

کہاں الطاف تم اخلاص کی گھٹڑی اٹھائے ہو
شرافت کی تجارت کا تو کاروبار مندہ ہے

○○

اب بھی ہو، اُلفت ہماری کیا پتا
جس میں کاٹی عمر ساری کیا پتا

وقت کی جھولی میں مجھ کو ڈال کر
کیسے رکھے گا مداری کیا پتا

تشنہ لب آہو کو اس کی کیا خبر
تیر لے کر ہو شکاری کیا پتا

کون سا تارا کہاں ٹوٹے گا کب
کب ترا ہو حکم جاری کیا پتا

اُس کی آنکھوں میں ہیں کچھ چنگاریاں
آب ہو وہ تابکاری کیا پتا

ہاتھ خالی وہ چھپا زیرِ زمیں
جیب میں ہو ریزگاری کیا پتا

وہ جو تھے الطافِ الفت سے خفا
کر ہی لیں اختر شماری کیا پتا

OO

درد یاس و بے قراری جب سے ہے
کیا بتائیں یہ خماری کب سے ہے

سر بہ زانوں ہیں مری ملت کے لوگ
رُوبکاری خود سے ہے یا رب سے ہے

تم تو افضل امتوں میں تھے میاں
یہ ریا کاری تمہاری کب سے ہے

جس کو سرمد جیسا ہونا ہے یہاں
دیکھ لو سر کو اُٹھائے چھب سے ہے

میں ہی رسی پر چلا ہوں دوستو
میری شہرت تو مرے کرتب سے ہے

اس پسینے سے ہے موتی کا حصول
بات کی قیمت تو اس کے لب سے ہے

ہم جسے الطافؔ کہتے ہیں یہاں
وہ جدا محفل میں بیٹھا سب سے ہے

OO

مرے سورج کو گہنایا بہت ہے
تعاقب میں کوئی سایا بہت ہے

ستارہ کر دیا ہے لفظ میرا
ترے لب نے مجھے گایا بہت ہے

فریبِ عہد سے اب اُس نے ہم پر
زمانے کا ستم ڈھایا بہت ہے

تماشے کو جسے تھا خلق کرنا
وہی صدیوں سے رقصایا بہت ہے

محبت کے عوض اس شہرِ زر میں
فریبِ دوستی کھایا بہت ہے

نہ کام آئے گی جو اس آخرت میں
تمہارے پاس وہ مایا بہت ہے

کمی الطاف علت میں کہاں تھی
نئی تعزیر وہ لایا بہت ہے

○○

اُس شوخ کی گلی میں چلا جا رہا ہے دل
پھر یاد کے قفس میں پھنسا جا رہا ہے دل

وہ کھیل کی تھی صبحیں یہ شامیں ہیں دھول کی
اِک آگ ہے کہ جس میں بھنا جا رہا ہے دل

کیسے کہیں کہ اس کی حقیقت نہیں ہے کچھ
خوابوں کے ہیر پھیر میں پھر جا رہا ہے دل

یہ کس طرف عذاب کی ظاہر ہے ساحری
یہ کس طرف ہمارا کھنچا جا رہا ہے دل

شاید میرے نواسے بھی ہوں اتنے خوش نصیب
اب جو کہ پوتروں میں لگا جا رہا ہے دل

عزّت اسے نصیب ہو بس ہے یہی دعا
الطافؔ اب کے شہرِ وفا جا رہا ہے دل

○○

اشک سے ہوتی ہوئی رشک گہر سے گزری
شے وہ کیا تھی جو مرے قلب وجگر سے گزری

اس نے چاہا بھی مجھے ترکِ تعلق بھی کیا
ایسی فنکاری کبھی پھر نہ نظر سے گزری

اب یقیں اس کا مجھے خود بھی نہیں ہوتا ہے
چاند کی رات مرے دیدۂ تر سے گزری

قحط لفظوں کا رہا اُس نے بچایا مجھ کو
تھی وہ کیا چیز کہ جو شوقِ ہنر سے گزری

اب نہ چہرے تھے وہاں اور نہ بدن تھے الطاف
میرے ہمراہ وہ آئینہ گھر سے گزری

OO

اُن گزرے برف موسموں کے قہر تو رہے
کچھ تلخ زندگی کا کوئی پھیر تو رہے
چاٹو گے لفظ میری کتابوں کے درد سے
تڑپو گے گر زبان پہ وہ شعر تو رہے
ہو وہ غزل کہ نظم قصیدہ کہ نعتیں
سب کچھ ہی مِرے سامنے کچھ دیر تو رہے
تھے درد اَن گنت جو بدن میں چھپے ہوئے
لیکن ہمارے واسطے وہ غیر تو رہے
الطافؔ زندگی کی کہانی ہے جس میں اب
اک دن ہمارے واسطے وہ لہر تو رہے

○○

نہیں بدل ہے جہاں میں کوئی تری محبت کا میرے بابا
حساب کرنے سے رہ گئی ہوں تری عنایت کا میرے بابا

میں تیرے آنگن میں جب اُگی تھی کیا تھا سیراب آنسوں سے
تو دھوپ کا ایک سائباں تھا مری حفاظت کا میرے بابا

تمہی تو کہتے تھے صبر کرنا اُداس لمحوں کے ذائقوں میں
میں صبر کرتی ہوں پاس رکھ کر تری نصیحت کا میرے بابا

مجھے ستاتا ہے لمحہ لمحہ اُداس چہرہ لباس تیرا
تمہاری خوشبو کے سارے جھونکے تری نفاست کا میرے بابا

مرے لہو کا یہ قطرہ قطرہ تری محبت کا آستاں ہے
رہے گا سایا تمہارا برسوں تری قرابت کا مرے بابا

بہت سی باتیں میں تم سے کرتی اُسی طرح سے تھی جب میں کم سن
تمہارے سب غم میں بانٹ لیتی تری مسافت کا میرے بابا

تمہاری ہر شاخ باثمر ہو یہ پھول تیرے قدم کو چومیں
مہک اُٹھے گل صدا ہی یارب تری محبت کا میرے بابا

میں تیرے نقشِ قدم پہ چل کر چنوں گی راہوں کے خار اکثر
تمہیں میں موقعہ کبھی نہ دوں گی کسی شکایت کا میرے بابا

یہاں بھی ہوتے ہیں سب نچھاور وہ چاہتوں کے ستارے مجھ پر
مگر وہ شفقت کا ہاتھ افضل تری طراوت کا میرے بابا

○○

تختی اداس ہے مرا بستہ اداس ہے
کاتوں میں کیا کہ پیار کا چرخہ اداس ہے

بیٹھک بزرگوں کی جو تھی کہاں گئی
لکڑی کا بنچ آج شکستہ اداس ہے

اسلاف کی جو عزتیں تھیں ختم ہوگئی
اپنے بڑوں سے جو تھا وہ رشتہ اداس ہے

آنکھوں سے غم غزہ کا عیاں ہے یہاں وہاں
گویا کہ آس پاس کا نقشہ اداس ہے

الطافؔ کو نہ جانے ہے یہ کیسی چپ لگی
اس کی غزل کا ہر کوئی مصرعہ اداس ہے

دن ہیں اگر فضاؤں میں راتیں ہوا میں ہیں
تیری محبتوں کی وہ باتیں ہوا میں ہیں
گزرا ہوں بعد مدتوں میں تیرے شہر سے
وہ بستیاں وہ رشتے وہ گھاتیں ہوا میں ہیں
جن راہوں سے چلے تھے ہم آوارہ سے منش
وہ دن بدل گئے ہیں وہ راتیں ہوا میں ہیں
جی چاہتا ہے چیخ کر آکاش پھاڑ دوں
اپنی محبتوں کی وہ ماتیں ہوا میں ہیں
سب کچھ یہاں بدل گیا الطافؔ میرے یار
پل پل جو گونجتی ہیں وہ نعتیں ہوا میں ہیں

○○

اپنے قفس میں خواب یہاں پالتے رہے
دانے محبتوں کے اُنھیں ڈالتے رہے

حقّے کی گُڑگُڑی میں رہے ناچتے ستم
صدمے چلم میں آگ کبھی ڈالتے رہے

پھر وقت کی سناں پہ ہے شمشیر آج کل
فولاد اپنے ہاتھ سے ہم گالتے رہے

وہ اب کے سرخ رنگ بھریں گے نگاہ میں
ہم برف رنگ پنچھیوں کو پالتے رہے

الطافؔ سب کے ہوتے حویلی ہے بے صدا
ہیں کون گنبدوں میں دیے بالتے رہے

○○

سائے کے ساتھ ساتھ کہاں میں سفر میں تھا
منزل کے آس پاس اکیلا مگر میں تھا

بادل تھے آسمان پہ، بارش نہیں ہوئی
پیاسی زمین، پانی کسی کی نظر میں تھا

طوفاں میں آندھیوں میں یہ جلتا رہا سدا
یہ سانس کا دیا بھی ہماری ڈگر میں تھا

ہوتے گئے طویل شبِ غم کے راستے
سورج کا انتظار ہمیں تو سحر میں تھا

الطافؔ اب ہیں خاک کی زینت بنے ہوئے
کل تک وہ جن کا پاؤں حصارِ قمر میں تھا

OO

سانسوں کے سُر پہ دل میں بہت ارتعاش تھا
یادوں کا جام گر کے تو بس پاش پاش تھا

تنہائی کے نگر میں ہیں سائے ہی ہر طرف
غم کا نہ کوئی اپنے سوا یار باش تھا

چھوڑا حیات نے جہاں بے نام سی جگہ
وہ لمحہ زندگی کا بہت دل خراش تھا

اس کے لئے تو موت ہی وجہ سکون تھی
وہ آشیاں جلاتا کوئی برق پاش تھا

الطافؔ اس کی شکل بنی ہے عجیب سی
آیا جو بزم میں وہ کوئی غم تراش تھا

OO

کچھ جام روبرو ہیں مگر بے دلی کے ہیں
حالات گردو پیش سبھی بے رُخی کے ہیں

شامل ہے جس میں عرق و لہو اور مشقتیں
اُن کھیتوں میں مکان کسی اجنبی کے ہیں

جو نیم کی ہواؤں نے مردہ سے کر دئے
پھولوں میں کچھ نشان ابھی زندگی کے ہے

آندھی نے اِس مکان کے تنکے اُڑا دئے
لیکن ابھی نشان تہ آراستگی کے ہیں

گھیسے جو عمر کے تھے ہیں سارے دریدہ اب
سکّے جو کھو گئے ہیں مری بے زری کے ہیں

الطافؔ اُس کے واسطے لفظوں کی شکل میں
کچھ پھول چھوڑ آیا ہوں جو چاندنی کے ہیں

○○